

صرف اخبار کا ہی وہ ٹکڑا بہرہ رہا تھا جس سے میں نے وہ کشتی بنائی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے وہ آنسو بھی جو بچپن میں یوں اپنی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر میری آنکھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ آنے والا بشر ا تھا، جواؤ پر آتے آتے پوری طرح بھیگ کر اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”خیر تو ہے بشرے..... اتنی صبح..... ایسے.....؟“

اتنے میں اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بشرے نے جلدی سے میرے بڑھائے ہوئے خشک تولیے سے اپنا سر خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ”خیر نہیں ہے جناب..... کل شام سے لارے بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات شدید بخار میں تڑپتی رہی ہیں..... خان صاحب نے آج صبح اور نیاز کی دیکسین چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بھی دعا کے لیے بلوایا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد نیاز بانٹنی ہے۔ آپ اس سے پہلے ہی پہنچ جانا..... دعا آپ نے ہی کرنی ہے۔ خان صاحب کی گاڑی آپ کو لینے آجائے گی۔ میں تب تک لکڑیاں اور مٹی کا تیل وغیرہ حویلی پہنچاؤں۔ بس آپ تیار رہیے گا۔“ بشری جیسے چھپ چھپ کرتا آیا تھا ویسے ہی سرسڑ کرتا اور بھینگتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے اُسے بہت کہا کہ درگاہ کی چھتری لیتا جائے لیکن اُس نے یہ کہہ کر مجھے لا جواب کر دیا کہ ”اوباؤ..... ان بارش کے قطروں سے بچنا نہیں چاہیے..... یہ تو رب ہماری رُوح کو دھونے کے لیے آسمان سے برساتا ہے.....“

اصغر صاحب چپ چاپ کھڑے ہماری ساری باتیں سنتے رہے۔ بشرے کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”دیکھا..... میں نے کہا تھا نا.....؟“

وہ نازک لڑکی محبت نامی اس زہریلے ناگ کا پہلا وار ہی برداشت نہیں کر پائی۔ زہر اس تیزی سے اُس کی کول نسوں میں پھیل رہا تھا کہ وہ نڈھال ہو کر بستر سے لگ چکی تھی۔ اور کیسی ستم ظریفی تھی کہ اُس کے مندل ہونے کی دعا کے لیے بھی اُسی کو طلب کیا جا رہا تھا جو خود اُن زخموں کا باعث تھا۔ گویا قاتل کو ہی میسائی کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ کوئی بھی بہانہ کر کے حویلی نہ جاؤں لیکن اصغر صاحب شاید میری سوچیں ہی پڑھ رہے تھے۔ وہ بول پڑے۔ ”تمہیں جانا چاہیے..... تمہی اُس کا زخم اور تمہی مرہم ہو..... نہیں جاؤ گے تو زخم اور گہرا ہو جائے گا۔ ہاں البتہ چلے جاؤ گے تو زخم تو لگے گا لیکن ساتھ ہی کچھ مرہم بھی دے آؤ گے..... سو میرا مشورہ یہی ہے کہ چلے جاؤ..... اور کوشش کرنا کہ زخم کے مقابلے میں مرہم زیادہ بائٹ پاؤ.....“

”لیکن کیسے.....؟“ میں چلا اٹھا..... اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے.....؟ آخر اُس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اُس کی ہنسی کیوں چھین لی گئی.....؟ یہ زخم اُس کا مقدر کیوں بن گئے ہیں.....؟ میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا.....“

”جب تم پر نقدیر کا وار ہوا تھا تب تمہارا کیا قصور تھا؟ تم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ تمہارے مقدر میں ہی عشق کا وہ کاری دار کیوں لکھ دیا گیا تھا جس نے ایک پل میں ہی تمہاری دنیا بدل دی؟ ان سب سوالوں کے جواب ہیں تمہارے پاس.....؟..... نہیں..... کسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا، لیکن بعض سزائیں بنا کسی جرم کے بھی تو جھگٹنا پڑتی ہیں۔ ہم تو اس دنیا میں آئے ہی جھگٹنے کے لیے ہیں۔ سو جب تک ایک بھی سانس باقی ہے، جھگٹتے ہی رہیں گے۔“

اصغر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ محبت کسی ناکرہ گناہ کی سزا ہی تو تھی۔ یہ سزا ملتی بھی دونوں کو تھی۔ جس نے محبت کی وہ تو خطا وار ٹھہرتا ہی ہے، یہاں تو اُسے بھی سولی پر لٹکانا پڑتا ہے جس سے دوسرے کو محبت ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ محبت ہمیشہ دواویسے لوگوں کے درمیان ہی کیوں وارد ہوتی ہے جن کا ملن دنیا کے ناممکنات میں سے ایک ہوتا ہے؟ کیا صرف ”لا حاصل“ کا نام ہی عشق ہے؟ اور جو حاصل ہو جائے وہ محبت نہیں۔۔۔۔۔ کیا ”حاصل“ کا درجہ عشق سے گر کر صرف ایک کامیابی کی طمانیت ہی رہ جاتا ہے؟

میں ظہر سے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا۔ بارش تھی کہ رُسکے کا نام ہی بھول چکی تھی۔ خان صاحب ہیر ونی ڈیوڑھی میں ہی چادر کی چھتوں والے سائبان کے نیچے اپنی نگرانی میں دس بارہ دیکھیں پکوانی کے بعد انگاروں پر چڑھوا رہے تھے۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکے۔ ”اچھا ہوا تم جلدی آگے عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ میری تو پریشانی میں مت ہی ماری گئی ہے۔ شہر سے ڈاکٹر نی بھی بلوائی گئی ہے لیکن اُسے بھی بخار نہ اترنے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی۔۔۔۔۔ وہ میرے ہاتھ کا چھالا ہے۔۔۔۔۔ میں اُسے اتنی اذیت میں نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔۔ سازی رات وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہڈیاں بولتی رہی ہے۔ کہیں یہ کوئی سائے وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت تو خود سب سے بڑا آسیب ہے۔ لیکن اس معصوم لڑکی کو تو شاید ابھی تک یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اُس پر محبت نامی اس عفریت کا سایہ اپنے نیچے گاڑ رہا ہے۔ اگر اصغر صاحب مجھے پہلے یہ خبر دار نہ کر چکے ہوتے تو شاید مجھے خود بھی اس حقیقت کا ادراک بہت دیر میں ہوتا۔ حیرت ہے ان بڑے بڑے سائنس دانوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے صدیاں لگا کر ہر بیماری کا کوئی علاج دریافت کر لیا تھا۔ انسان ترقی کرتے کرتے اب چاند پر اپنی کالونیاں بنانے کا سوچ رہا ہے، لیکن محبت نامی اس بیماری کا کوئی علاج کیوں نہیں دریافت کر پائے تھے۔ کیوں ہمارے خون میں موجود ان زہریلے مادوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے تھے جو ہماری اس کجلی نظر کے مرکب سے مل کر اس عشق نامی ناسور کا باعث بن جاتے تھے۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ محبت ایک سرطان کی صورت میں تو ہمارے سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ تو پھر جسم کے باقی سرطان کی طرح ہم ہسپتال جا کر اپنے جسم کے اس کینسر کو کیوں نہیں باہر نکالوا سکتے؟ کیوں باقی ناسوروں کی طرح کٹوا کر نہیں پھینک سکتے۔۔۔۔۔؟

کچھ ہی دیر میں ساری دیکھیں تیار ہو گئیں۔ حویلی کے ہیر ونی احاطے میں ہی شامیانے لگا کر اور ان کی چھتوں پر بڑی بڑی پلاسٹک کی شیش ڈال کر کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور زور درواز کے علاقوں میں بھی نیاز باٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام نے دیگوں کے کھٹنے پر ہر دیگ میں سے کچھ چاول اور زردہ وغیرہ لے کر اس پردہ عا پڑھ کر دم کیا۔ خان صاحب نے خصوصی طور پر مجھ سے دعا کروائی اور پھر سب دیکھیں گاؤں کے لوگوں اور دیگر غریبائیں بانٹ دی گئیں۔ عصر کے وقت ہم اس فریضے سے مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

اس اثناء میں اندر سے بڑی مالکن کا دو تین بار پیغام آچکا تھا کہ میں ذرا فارغ ہو چکوں تو اُن سے اندر آ کر مل لوں۔ تیسری بار جب کرم دین اندر سے پیغام لے کر آیا تو خان صاحب نے میری جانب دیکھا اور ہلکے سے مسکائے۔

”عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ تم اندر مل آؤ، اُن سے۔۔۔۔۔ ورنہ یہ پیغام آتے ہی رہیں گے۔ میں بھی بس ان سب کو نپٹا کر آتا ہوں۔۔۔۔۔ چائے ہم بڑے کمرے میں ہی پیئیں گے۔ جلدی نکلنے کی نہ کرنا۔“

میری کوشش یہی تھی کہ میں اور خان صاحب اکٹھے ہی اندر جائیں لیکن آخر کار مجھے اکیلے ہی حویلی کی دوسری ڈیوڑھی پار کرنا پڑی۔ بڑی مالکن سامنے والے برآمدے میں ہی موسیٰ کی بازو کے پیچھے والے حصے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب نکلیں۔ اُن سے پتا چلا کہ لاریب کا بخار اب بھی ویسا ہی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

”عبداللہ..... تم لاریب سے ملو گے نہیں..... دیکھو گے نہیں کہ میرا وہ پھول کیسے کھلا سا گیا ہے..... میری وہ مینا اپنی ساری باتیں، اپنی تمام چہکار کیسے بھول گئی ہے..... مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اُس کی تسلی کے لیے وہ لفظ موجود ہوں گے جو اُس کے چلتے وجود کو جلا بخش سکتے ہیں۔ اُسے تم ہی سمجھا سکتے ہو کہ..... کہ.....“

بڑی مالکن بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ شاید وہ اپنے الفاظ کھوٹ بیٹھی تھیں۔ لیکن اُن کی اس خاموشی نے بھی سب کچھ کھڑا ڈالا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا گویا انہیں بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس فسانے کی خبر ہو چکی تھی، یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود لاریب کے منہ سے ہدائیانی کیفیت میں کچھ نکل گیا ہو۔ میں کچھ دیر متذبذب میں رہا۔ خود میرے لفظ بھی کہاں میرے اختیار میں تھے۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میرا اُس سے ملنا ٹھیک ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں..... آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“

”ہاں..... میں سمجھ رہی ہوں..... لیکن تمہارے علاوہ کوئی اور مسیحا بھی تو نہیں..... ابھی اُس کا گھاؤ بہت تازہ ہے اور اُسے شاید خود بھی اس جان لیوا جذبے کا پوری طرح اور اک نہیں ہے جو اُس کے اندر پل رہا ہے۔ خدا کے لیے اُسے روک دو۔ اُس کے معصوم اور چھوٹے جذبے کو کھرنے سے پہلے ہی کسی طرح پلٹ دو..... یہ ہم سب پر تمہارا کتنا بڑا احسان ہوگا یہ تم نہیں جانتے.....“ بولتے بولتے اُن کی آواز بھرا سی گئی اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ میں سر جھکا کائے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتبار کے بھرم پر پورا اتر سکوں۔ آپ کہیں تو میں آج ہی ہمیشہ کے لیے بنا کسی کو کچھ بتائے یہاں سے اتنی دُور چلا جاؤں گا جہاں کسی کو کبھی میری کوئی خبر نہیں مل پائے گی..... کاش میں کبھی جبل پور نہ آتا..... میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں.....“

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو..... میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنے شفاف ہو..... اور پھر تمہارے دُور جانے سے لاریب کے اندر جنم لیتا جذبہ بھی تو دُور نہیں چلا جائے گا۔ آج مجھے یہ کہنے میں بھی ذرا سی عار محسوس نہیں ہوتی کہ اگر تمہارا من پہلے ہی سے زہر اسے نہ بندھا ہوتا تو میں کسی بھی طرح تمہیں تم سے لاریب کے لیے مانگ لیتی۔ کیوں کہ وہ صرف میری بیٹی ہی نہیں میری سب سے عزیز از جان سہیلی بھی ہے۔ اور میں اپنی سہیلی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر ٹپ اُٹھتی ہوں۔ پل پل مرتی رہتی ہوں۔ اور مجھے اپنی دوست کی ہر پسند پر ہمیشہ فخر رہا ہے..... اور آج بھی مجھے اُس کے انتخاب پر رشک آرہا ہے..... کاش یہ انتخاب ہی اُس کا مقدر بھی ہوتا..... لیکن کیا کریں کہ ہمارا زور نصیبوں کے کلبے پر چل نہیں پاتا.....“ میں چپ رہا اور اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا لاریب کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک خادمہ پہلے ہی اُس کے سر ہانے بیٹھی اُس کا سرد باری تھی۔ باہر بارش اور بادلوں کی وجہ سے کمرے میں ملگجاسا اندھیرا پھیلنا ہوا تھا اور مجھے چاروں طرف کتابوں کے ریک اور شیلف بھرے پڑے نظر آئے۔ غالب، میر، درو، اقبال، فراز..... اودہ..... تو گویا اُس نے اپنی رُوح کے قتل کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔

یہ شاعری ہی تو اپنے اثر سے ہمارے اندر کے بند دروازے کھولتی جاتی ہے۔ اور پھر ہم خود ہی اپنے دل کے اندر گھس آنے والے در انداز جذبوں کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔

لاریب آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔ ایک گرم لحاف نے اُسے ڈھک رکھا تھا اور اُس کے چہرے پر برسوں کی پیلاہٹ اور زردی نمایاں تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے چہرے کے نور سے جو ایک ہالہ سا بننا تھا وہ غیر مرئی ہالہ آج بھی اپنا سفید نور بکھیر رہا تھا۔ بڑی مالکن نے لاریب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خادمہ اٹھ کر باہر نکل چکی تھی۔ ”لاریب..... دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے.....“

آہٹ سن کر لاریب نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا اور اُس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بڑی مالکن نے جلدی سے اُسے سہارا دے کر اُس کے لیے نیچے کا ٹیک بنادیا۔ وہ اب بھی ہڑبڑائی ہوئی سی تھی۔ اُس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بال باندھنے کی کوشش کی۔

”ارے آپ.....؟..... یہاں؟..... کتنی خوشگوار حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ میں بتا نہیں سکتی.....“ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ کے سرخی میں بدلنے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ مجھے پھر ان جذبوں کی طاقت پر رشک آیا۔ سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے طبیب تو خود ہمارے اندر ان جذبوں کی صورت میں پل رہے ہوتے ہیں، پھر نہ جانے کیوں ہم ان بیرونی ویدوں کے پیچھے دوڑے پھرتے ہیں؟

میں نے پاس پڑی کرسی کھینچ لی اور بیٹھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے..... اگر غالب کو پڑھتی ہیں تو پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُس نے بیمار ہونے کے لیے کسی بیمار دار کے نہ ہونے کی شرط بھی لگا رکھی ہے۔ جب کہ آپ تو یہاں پورا ایک میلہ سجائے بیٹھی ہیں اپنے بیمار داروں کا..... حتیٰ کہ مجھے بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر رہی ڈالا۔“

میری بات سن کر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ جھڑنا پھر سے پُر شور آواز کے ساتھ بہہ کر نکلا اور پوری حویلی کے درود یوار پر چھا گیا۔ بڑی مالکن غور سے اپنی سیملی کو دیکھتی رہیں اور اُن کی آنکھیں غیر محسوس طور پر بھینکتی رہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی بہانے سے اب تک پونچھتی ہی آتیں تھیں۔ وہ ہنس کر بولی۔

”بس یہیں میں غالب سے اتفاق نہیں کرتی۔ بھلا ایسے بیمار پڑنے کا فائدہ ہی کیا کہ کوئی آس پاس بیمار داری اور خیرے اٹھانے کے لیے موجود ہی نہ ہو۔ جناب ہم تو اپنے ساتھ ہی سبھی کو بیمار کرنے کے قائل ہیں یعنی پڑیے گر بیمار..... تو سب ہوں آس پاس بیمار..... کیوں ٹھیک ہے نا.....“ کچھ ہی دیر میں وہ اپنی بیماری بھول کر ہمارے ساتھ بحث کر رہی تھی۔ بڑی مالکن نے درمیان میں چائے کا انتظام کروانے کے لیے کچھ دیر کی مہلت مانگی اور میں اور لاریب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ میں نے غور سے اُس پری کی جانب دیکھا۔

”آپ کے ماں باپ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ آپ سے زیادہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کے ارد گرد کا کچھ لوگ رہتے ہیں..... جن کی خاطر آپ کو خود اپنے اندر کا شیشہ بہت سنبھال کر

رکھنا ہوگا۔ ورنہ یقین جانے آپ سے پہلے ان افسوس انگیز رشتوں کو کچھ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آپ کو اس خزانے کی حفاظت بھی کرنی ہوگی۔۔۔۔۔“
وہ میری بات سن کر چونک سی گئی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اپنی ہی پوری کوشش بھی کرتی ہوں لیکن نہ جانے کچھ دن سے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میرا خود اپنے اوپر سے اختیار گھٹنا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میں آپ سے چھپاؤں گی نہیں۔۔۔۔۔ شاید آپ کو سن کر برا بھی لگے لیکن پتا نہیں کیوں جس دن سے آپ کی امی سے مجھے آپ کی کہانی کے بارے میں پتا چلا ہے میں تب سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر لمحہ آپ ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ مجھے آپ کے جذبے کی طاقت اور سچائی پر رشک آتا ہے اور میں خود اپنے آپ کو بھی ایسے ہی کسی جذبے کے تحت بہتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں اور یہ عزت ہر پل مجھے اپنے اندر چلتی اور بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنے اندر ہوتی ان تبدیلیوں کا سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی رُوح کے آخری ریشے تک کسی اور کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ، یا باقی دنیا میرے اندر پلتے اس الوہی جذبے کو کچھ غلط نہ سمجھ لیں۔ کسی عام رشتے کا نام نہ دے دیں۔“

وہ سر جھکائے بولتی رہی۔ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ آج پہلی بار اس نے اتنا کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی اور باہر کھڑکی سے تیز بارش کی گرتی بوندوں کا شور میری اور اس کی رُوح کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔



ڈاٹ کام

دوسری منت

پھر آخر کار میں نے ہی خاموشی توڑی۔

”آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں، یا آپ کے ارد گرد بیٹے والا کوئی بھی ذی روح کبھی آپ کے کسی بھی جذبے کو غلط ہونے کا الزام دینے کا سوچ بھی سکتا ہے۔ ہم سب آپ کے اندر کے شفاف اور کوئل جذبوں کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں جس کے وہ حق دار ہیں۔ اور آپ کی سچائی تو آپ کے اندر چلتی اُس جنگ سے اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی شدت نے آپ کو یوں بستر پر لپٹا دیا ہے۔ یقین جانیئے ہم سب کے دلوں میں آپ کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ بس میری آپ سے اتنی درخواست ہے کہ ایسے ہر جذبے کو اپنی طاقت بنالیں۔ اُسے اپنے اندر خود پر حاوی ہو کر آپ کو کمزور نہ کرنے دیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بہت مشکل کام ہے لیکن آپ جیسی سچی، شفاف اور کوئل من کی لڑکی سے میں ہر معجزے کی امید رکھتا ہوں۔“

وہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ ”میں نے کہا تھا نا..... آپ کو اپنے لفظوں پر خوب اختیار حاصل ہے..... خوب چن کر یہ خزانہ استعمال کرتے ہیں آپ۔“ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”چلیں..... آج آپ سے یہ وعدہ بھی رہا کہ میں اپنے اندر کی اس جنگ پر قابو پانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ لیکن آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی جنگیں جیتنے کے لیے ہم کمزور انسانوں کے پاس کوئی ہتھیار، کوئی آلہ نہیں ہوتا۔ تبھی عام طور پر ہماری شکست ہوتی ہے اور ان جذبوں کی جیت..... آپ خود بھی تو ابتدا میں ایک ایسی ہی جنگ ہار چکے ہیں..... دعا کیجیے گا کہ خدا مجھے بھی آپ جیسا ظرف عطا کرے..... میں بھی اتنی ہی ثابت قدم اور چٹان جیسی مضبوط بن سکوں کہ میرے اندر چلتے طوفان میری ظاہری ہیبت کو بگاڑ نہ سکیں اور اُس پاس کے لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو سکے..... بولیں..... دعا کریں گے نا میرے لیے.....؟“

”میری ہر دعا میں آپ تا عمر شامل رہیں گی۔“

اتنے میں دروازے کی جانب سے آہٹ بلند ہوئی اور خان صاحب بڑی مالکن کے ساتھ کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں خادمہ نے چائے بھی اُسی کمرے میں لٹرائی پر سجادی۔ میں نے چائے ختم کر کے خان صاحب سے اجازت چاہی۔ بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں نے لاریب کو خدا حافظ کہا اور خان صاحب کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے رخصت کرنے سے پہلے انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے زور سے بھینچ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”آج نہ جانے کیوں تم جیسے ایک بیٹے کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے.....“ میں کچھ بکھلا سا گیا۔ ”آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟..... کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں.....؟“ انہوں نے اپنی نرم پلکیں پونچھیں ”ہاں..... واقعی آج تم نے ایک بیٹے سے زیادہ بڑھ کر بیٹے کا حق ادا کیا ہے۔ ایک بیٹی کے باپ کو اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے

ہوگا.....“ میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا اور پھر وہ چھپا نہیں پائے کہ وہ میری اور لاریب کی ساری گفتگو سن چکے ہیں۔ دراصل باہر کھانا کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس آئے تب انہوں نے لاریب کے کمرے کا رخ کیا۔ ٹھیک اُسی وقت بڑی مالکن جو چائے کے لیے کمرے سے نکل چکی تھیں انہیں لاریب کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر روک لیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن پھر دروازے کے قریب ہونے کی وجہ سے خود اُن کے کان بھی ہماری باتوں کی جانب لگ گئے اور پھر ہر بات انہیں سمجھ میں آتی گئی۔ شاید بڑی مالکن اُس وقت کمرے سے جان بوجھ کر باہر نکلی تھیں تاکہ اُن کی دوست اُن کی سہیلی بنا کسی جھجک کے اپنے دل کی بات مجھ سے کر سکے۔ شاید یہ اُن کا مجھ پر حد سے گزرا ہوا مان بھی تھا اور اسی مان کے آگینے کا بھرم رکھنا میرا بھی فرض ہو گیا تھا۔ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

”آپ بے فکر رہیں لاریب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی..... آپ بہت خوش قسمت ہیں خان صاحب کہ آپ کو خدائے لاریب جیسی بیٹی دی ہے..... اور ایسے انمول تحفوں کی حفاظت دینے والا خود کرتا ہے..... اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہم خود اپنی مرضی سے بناتے اور چنتے ہیں..... جیسا کہ میرا آپ سے، بڑی مالکن سے اور لاریب سے رشتہ ہے..... جو ہم سب نے خود چنا ہے اور ہم سب ہی اس رشتے کی بے حد عزت کرتے ہیں..... اسے جان سے عزیز جانتے ہیں۔“

میں انہیں گلے لگا کر درگاہ کے لیے پلٹ گیا۔ وہ دیر تک وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے گاڑی کو دوڑ جاتا دیکھتے رہے۔ میرا دل اُس وقت شدت سے بس یہی ایک دعا کر رہا تھا کہ ”اے میرے خدا اس مجبور باپ کے سامنے میری لاج رہ جائے اور وہ خود اپنی ذات کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ اُن کے اعدا کا باپ کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہو.....“

قدرت نے دنیا میں جتنے بھی رشتے بنائے ہیں اُن میں سب سے مجبور رشتہ شاید باپ کا ہی بنایا گیا ہے، خاص طور پر اگر یہ رشتہ ایک بیٹی سے شدید محبت کرنے والے ایک وضع دار باپ کا ہو، تب اس مجبوری اور بے کسی کی حدیں لامحدود ہوتی ہیں۔

میں جب درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری جانب بڑھے۔

”کہاں رہ گئے تھے۔ بڑی دیر لگا دی۔“

میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا ”خیریت.....؟“

”ہاں..... مجھے میرے مقتول کی اطلاع مل گئی ہے۔ اگلی جمعرات کو پچھلی پہاڑی کی طرف سے آتی ہوئی گاؤں کی کچی سڑک پر مجھے اُس کا ایک خاص مقام پر انتظار کرنا ہوگا اور اُسے وہیں ختم کر کے اپنے آزادی کا پروانہ حاصل کرنا ہوگا۔“

اصغر صاحب کی بات سن کر میرا دل جیسے ایک لمحے میں ہی ڈوب سا گیا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں ہی پُر جوش سے ساری تفصیلات بتاتے رہے کہ کیسے آج چھلاوے نے انہیں درگاہ کے باہر بلوا کر وہ ساری تفصیلات اُن کے حوالے کی تھیں۔ وہ بہت خوش تھے کہ آخر کار اُن کی آزادی کا دن بھی آ ہی گیا تھا۔ بس چند دن ہی تو رہ گئے تھے۔ لیکن تجھی میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں اُن کے ہاتھوں سے یہ گناہ کبیرہ سرزد ہونے نہیں دوں گا، چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ چاہے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن انہیں اس آخری جرم سے روکنا میری آخری

خواہش بنتی جا رہی تھی۔

کاش اس وقت سلطان بابا وہاں ہوتے تو میں خود کو اس قدر تنہا محسوس نہ کرتا۔ اس رات میں نے دو خط لکھے..... پہلا زہرا اور دوسرا عبداللہ کے نام اور صبح ہوتے ہی دونوں خط نیچے گاؤں کے پوسٹ ماسٹر کو مزید پیسوں اور اس درخواست اور تاکید کے ساتھ پکڑا آیا کہ اسے کسی بھی طرح شام سے پہلے کسی بڑے اسٹیشن سے فوری ڈاک، یا کوریئر کے حوالے کروا دیں کیوں کہ اگلی شام تک ان خطوط کا اپنی منزل تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اسی وقت صبح نو بجے والی گاڑی سے یہ دونوں خط شہر بھیج دیں گے جہاں سے انہیں اُن کا کوئی ماتحت، یا دوست کوریئر کر دے گا۔ میں نے پوسٹ آفس سے ہی زہرا کے گھر فون کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دو دن سے برستی بارش نے ٹیلی فون کی سہمی لائیں تھیں نہس کر رکھی تھیں۔ میں اب صرف یہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ میرے دونوں خطوط وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ اُس دن بھی بارش نے رُکنے کا نام نہیں لیا اور شام تک بادل اپنا رونا روتے رہے۔ عصر کے بعد کرم دین اور بشر آئے۔ بڑی مالکن نے اُن کے ہاتھ خاص اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کی مٹھائی اور چنے کی دال کا حلوہ ناریل کی قاشوں میں بھر کر بھیجا تھا۔ اصغر صاحب اپنی مسکراتی اور معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ میں نے نظر بچا کر کرم دین کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ذرا دُور لے جا کر اُس سے اُس کی چھوٹی مالکن کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ کرم دین فوراً ہی اُواس ہو گیا۔ ”اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے جی..... شام تک طبیعت کچھ سنبھلی تھی پھر رات کو دوبارہ بخار چڑھ گیا۔ آپ دعا کریں جی کہ وہ جلد بھلی چنگی ہو جائیں..... ہم سب تو اُن کی ہنسی اور اُن کی ڈانٹ پر ہی زندہ ہیں.....“ میں نے کرم دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی ”فکرمت کرو..... جولوڑکی اتنے بہت سے لوگوں کی زندگی کا باعث ہوا ہے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ بشر اور کرم دین زیادہ دیر ٹھہرے نہیں اور چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد اصغر صاحب نے شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”کیا بات ہے میاں.....؟ بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے..... خوش نصیب ہو.....“ میں بھی اُن کی اس شرارت پر مسکرا پڑا۔ ویسے بھی انہیں جب سے اپنی آزادی کی خبر ملی تھی تب سے وہ بہت خوش رہنے لگے تھے۔ سارا دن کچھ نہ کچھ گنگنا تے رہتے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”کیسی ہے وہ.....؟“

گویا انہیں خبر ہو گئی تھی کہ میں کرم دین سے کیا بات کر رہا تھا۔ ”وہ ٹھیک نہیں ہے..... ایک منت مانگی ہے میں نے بھی آپ کی طرح..... دعا کریں کہ اُس کے لیے مانگی گئی میری وہ منت بھی قبول ہو جائے.....“

اور پھر خط بھیجنے کے تیسرے دن یعنی بدھ کی سہ پہر میری منت قبول ہوئی گئی۔ اُس روز آسمان صبح سے صاف ہو چکا تھا اور چمکتی دھوپ میں ہر ذہلا منظر جگمگا رہا تھا۔ اسی خبرہ کرتی دھوپ کی نرم کرنوں کے درمیان درگاہ کے احاطے میں میری قسمت کا سورج تب جگمگا یا جب میں تھک کر مایوس ہونے کو تھا۔ اصغر صاحب بھی درگاہ کے صحن میں انگوروں کی بتل کی جانب چلتے پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ پہلے اُنہی کی نظر درگاہ کے دروازے کی جانب اُٹھی اور پھر میں نے اُن کی حیران نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خود بھی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ہاں..... وہ وہی تھی..... اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ، اُسی شاہانہ جلال کے ساتھ، اُسی کالے نقاب میں، اُسی طرح پانیوں پر تیرتی راج ہنسنی کی طرح چل کر آتے

ہوئے..... ہاں وہ زہرا ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی..... میں نے خط لکھ کر اُسے بلا تو لیا تھا اور مجھے یقین بھی تھا کہ وہ میری پکار پر وہاں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچے گی بھی ضرور..... لیکن اس کے باوجود بھی میں اُسے یوں اپنے سامنے پا کر اس طرح گم صدم کھڑا تھا جیسے اب بھی وہ کوئی خواب ہی ہو..... میرا سب سے حسین خواب..... وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں..... آپ نے ہی تو بلایا تھا.....“

”ہاں..... لیکن آپ یہاں تک پہنچ بھی گئی ہیں..... مجھے اس کا یقین تو ہو جانے دیں.....“

میری بات سن کر اُس کی آنکھوں میں شرارت کی لہر تیر گئی۔

”آپ کہیں اور ہم نہ آئیں..... ایسے تو حالات نہیں.....“

پھر اچانک ہی جیسے مجھے ہوش سا آ گیا۔ ”لیکن آپ یہاں تک اکیلے..... میرا مطلب ہے.....“ ”نہیں میں اکیلی بھلا یہاں تک کیسے پہنچتی، ای اور ڈرائیور نیچے گاڑی میں ہیں۔ امی کے گھٹنے اتنی چڑھائی کے متحمل نہیں ہو سکتے.....“ میں جلدی سے اصغر صاحب سے اجازت لینے کے لیے اُن کی جانب بڑھا۔ وہ پہلے ہی سے حیران کھڑے تھے۔

”یہ پری کون ہے عبداللہ میاں۔“

”یہی ہے میری منت..... میری دعا..... اس کو مانگا تھا میں نے خدا سے لاریب کا درد کم کرنے کے لیے۔ زہرا کی اماں نیچے میرا انتظار کر رہی ہیں..... میں انہیں حویلی چھوڑ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔“ وہ یوں ہی حیرت زدہ کھڑے رہ گئے۔ میں زہرا کو لیے نیچے پہنچا تو اُس کی امی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جانے اس لمحے اُن پر اتنا پیار کیوں آ گیا کہ میں سلام کرتے ہی اُن کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی بالکل میری امی جیسی ہی تو تھیں۔ اپنی اولاد کے لیے ہر وقت ہر مشکل میں ساتھ دینے کے لیے تیار، ہر خوشی ہر غم میں اُس کے ساتھ اور شریک سفر..... آج بھی وہ میری ایک پکار پر زہرا کے ساتھ یہاں اتنی دُور آ پہنچیں تھیں۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہلکے سے میرا سر تھپتھا کر مجھے خاموش کروا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس بار باقاعدہ زہرا کے ابا سے اجازت لے کر اُسے یہاں تک لائی ہیں۔ وہ خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر نے اُن کی بیماری کی وجہ سے انہیں کار کے اتارنے لے سفر سے منع کر رکھا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی دعاؤں کے ساتھ اپنے خصوصی محافظ اور ڈرائیور کے ساتھ زہرا اور امی کو بھجوایا تھا۔

میں جب زہرا کی گاڑی میں حویلی پہنچا تو خان صاحب اور بڑی مالکن اتنی دُور سے آئے خاص مہمانوں کو اپنے درمیان پا کر نہال ہی تو ہو گئے۔ وہ سب عاتبانہ طور پر زہرا کو پہلے ہی سے جانتے تھے اور اُسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے خط لکھ کر زہرا کو لاریب کے بارے میں سبھی کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس معصوم لڑکی کی مسیحتی کے لیے مجھے اُس کی شدید ضرورت ہے۔ میری اپنی ایک غرض بھی اس درخواست میں پنہاں تھی۔ میں جمعرات سے پہلے ایک بار زہرا سے ملنا چاہتا تھا کیوں کہ جمعرات کے دن میں نے اصغر کو اس بھیا تک جرم سے روکنے کے لیے خود اس شکار گاہ میں پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا جہاں انہیں اپنا آخری جرم سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس موقع مقتول کی جگہ خود لینے

کا ارادہ کیا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں کسی بھی طرح اُن کو اس آخری گناہ سے روک سکوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بات صرف اصغر صاحب کی نہیں ہے۔ میرا واسطہ وہاں اس انجانی مخلوق سے بھی پڑ سکتا تھا اور ضروری نہیں تھا کہ میں زندہ وہاں سے واپس آ پاتا۔ لیکن یہ جو تو مجھے کھیلنا ہی تھا اور اس آخری بازی سے پہلے میں اپنی زندگی کے سرمائے سے آخری بار مل لینا چاہتا تھا۔ مگر اور پچا کو میں نے اس لیے خبر نہیں کی تھی کہ میں آخری لمحوں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

البتہ زہرا کو میں نے اصغر صاحب، یا چھلاوے کی اس داستان کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُسے بس لاریب کی بیماری کا ہی پتا تھا اور یہ کہ میں نے اُسے محبت کے گھاؤ کے آخری مرہم کے طور پر جنبل پور بلوایا ہے۔ ساری عورتیں ذرا سی دیر میں ہی آپس میں یوں گھل مل چکی تھیں جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ اندر زنا نے کی جانب سے اُن سب کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں یہاں مردانے میں مجھ اور خان صاحب تک بھی آ رہی تھی۔ خان صاحب کو بھی شاید کچھ سمجھ آ رہا تھا کہ میں نے زہرا کو وہاں کیوں بلوایا ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ قلم لیا۔

”عبداللہ میاں..... اور کتنے احسان کرو گے مجھ پر.....؟ اُس دن تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ لاریب جیسا ہیرا میرے پاس ہے۔ تو آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس روئے زمین پر تم سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہیں، جس کے پاس بیک وقت اتنے اصول رشتے موجود ہیں اور اُن میں زہرا جیسا نگینہ بھی شامل ہے۔

میں نے درگاہ واپسی سے پہلے زہرا کو کچھ دیر کے لیے اندرونی ڈیوڑھی میں بلوایا تھا تاکہ اُسے یہ بتا سکوں کہ شاید میں شام کو حویلی نہ آ سکوں کیوں کہ مجھے درگاہ کے چند ضروری کام پنپنا ہے۔ وہ کچھ ہی دیر میں وہاں آ گئی..... وہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔

”کیوں ابھی ساحر صاحب..... اور کہاں کہاں اپنا سحر بکھیرا ہے آپ نے۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ سلطان بابا کا ہاتھ بٹاتے ہوں گے لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور ہے۔“

میں مسکرا دیا۔ ”یہ میرا سحر نہیں..... بس آپ سے ہوئی ایک ملاقات کا اثر ہے۔“ میں نے جلدی جلدی اُسے ساری بات سمجھا دی۔ زہرا غور سے میری بات سنتی رہی۔

”آپ بے فکر رہیں..... میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے مجھ پر کئے گئے اعتماد کا بھرم رکھ سکوں.....“

میں مسکرا کر جانے کے لیے پلٹا تو اُس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

”ساحر.....“

میں نے ڈک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ ہنگامی پلکیں لیے کھڑی تھی۔

”مجھے آپ پر فخر ہے..... آپ میرا مان ہیں.....“

میں کچھ بھی تو نہیں بول پایا۔ بس اگلے ہی لمحے خود میری آنکھیں جھپک جھپکی تھیں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب دو آنسو میری آنکھوں سے نکلے اور پھسل کر میرے گالوں تک آ پہنچے۔ پل بھر میں ہی اس دل برنے میرے سات جنموں کی ریاضت، میری ساری مشقت، ساری محنت کا معاوضہ

اپنے پگھڑی لمبوں سے دو لفظ بول کر ادا کر دیا تھا۔ کیا اس حقیر زندگی کو کسی دیوی کے چرنوں کی بھیٹ چڑھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مل ہو سکتا تھا۔ کیا اس لمحے کے بعد بھی جینے کی کوئی اور وجہ باقی رہ جاتی تھی.....؟ ہم دونوں بھی کتنے عجیب تھے، زمانے میں بچھڑنے والے ایک دوسرے کو رو کر وداع کرتے ہیں..... جب کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں اس لیے آنسو تھے کہ ہم ایک دوسرے کو رفتہ رفتہ پارہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ مزید ایک بل بھی وہاں رک نہیں پائی اور جلدی سے اپنی پلکوں کی شبنم اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹتی ہوئی وہاں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کو وہاں موجود نہ پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں اُن کا منصوبہ بدل تو نہیں گیا۔ انہوں نے جمعرات کا بتایا تھا مجھے۔ پر کہیں انہوں نے ایک دن پہلے ہی اپنا جرم سرانجام دینے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا۔ خدا نے زہرا کو یہاں تک پہنچا کر میری ایک دعا تو پوری کر دی تھی لیکن دوسری دعا۔ میرا دوسرا خط میں نے عبداللہ کے نام لکھا تھا کہ کسی بھی طرح سلطان بابا کو جمعرات سے پہلے جبل پور والی درگاہ پہنچنے کا پیغام دے، بتائیں اس خط کا کیا بنا؟

میں کچھ دیر وہیں درگاہ میں اصغر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر بے چین ہو کر درگاہ سے باہر نکل آیا۔ مجھے اصغر صاحب نے پچھلے پہاڑ کی اس پگ ڈنڈی کا بتایا تھا جہاں بنی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی متروکہ سی ایک عمارت کے کھنڈراب بھی موجود تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں کوئی مسافر خانہ، یا سستانے کے لیے کوئی قیام گاہ رہی ہوگی۔ اصغر صاحب نے اسی کھنڈر میں وہ خون کرنا تھا۔ میں بے قراری میں اُس مسافر خانے کے کھنڈر کی جانب ہی چل پڑا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کھنڈر یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور شام کا اندھیرا اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے میرا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ لیکن میرے اندر کی بے قراری میرے قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ پھر اچانک دو کوس کے فاصلے پر پہنچتے ہی ایک موڑ پر مجھے اصغر صاحب کا دُور گھائی میں ہیولہ سا دکھائی دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے درگاہ کی جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کر کے سکون کی ایک لمبی سی سانس لی۔ لیکن پل بھر میں ہی میری وہی سانس میرے حلق میں انک گئی۔ اصغر صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا جسے وہ آس پاس کی چٹانوں پر تیز کرنے کے سے انداز میں رگڑتے چلے آ رہے تھے۔ تو کیا انہوں نے خون کر دیا تھا.....



خوابوں کا بیوپاری

اتنے میں اصغر صاحب کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی، وہ کچھ ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں بھاگتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ میرا سانس دھکنکی کی طرح چل رہا تھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔“ وہ حیران سے تھے۔ ”بتایا تو تھا تمہیں کل جمعرات ہے نا۔ میں ذرا کھنڈر تک گیا تھا۔ کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے۔ لیکن تم اس ڈھلتی شام میں کہاں چل دیے۔“

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گویا میرا شک غلط تھا۔ میں نے انہیں ٹال دیا۔ ”کہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ بس آپ درگاہ میں نہیں تھے تو پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ چلیں واپس چلتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ میں انہیں ساتھ لیے واپس درگاہ آ گیا۔ انہیں اگلی شام سے پہلے کھنڈر پہنچنا تھا اور کھنڈر میں اُس شخص کا انتظار کرنا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے اُن سے بھی پہلے درگاہ سے نکل کر اس کھنڈر والے راستے پر کسی ایسی جگہ مورچہ لگانا تھا جہاں سے اُس آنے والے شخص پر بھی نگاہ رکھ سکتا اور اُسے وہاں سے پکڑ کر مجھے خود کھنڈر بھی پہنچنا تھا۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ صبح کرم دین خان صاحب کا پیغام لے کر آیا کہ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر مجھے حویلی بلوایا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہرا کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا، جس پر اس کی جاں فزا تحریر میں صرف دو سطریں تحریر تھیں کہ

”دل پر لگے وار کا کافی گہرے اور کاری ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن مطمئن رہیے آپ کا بھیجا ہوا مسیحا بھی کچھ کم مشاق نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ اپنا زخم آزمائیں ہم اپنا مرہم آزمائیں گے۔۔۔۔۔۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں نے اُسی رقعے پر یہ شعر لکھ دیا۔

اُشتی	رہتی	ہے	ایک	گرد	مجھ	میں
کون	پھرتا	ہے	در	بدر	مجھ	میں
مجھ	کو	مجھ	میں	جگہ	نہیں	ملتی
وہ	ہے	موجود	اس	قدر	مجھ	میں

میں نے رقعہ کرم دین کے حوالے کیا اور اُس سے کہا کہ آج میری جانب سے خان صاحب اور مہمانوں سے معذرت کر لے کیونکہ مجھے ایک بہت ضروری کام سے درگاہ سے باہر جانا ہے لہذا آج دیر ہو جائے گی۔ زندگی رہی تو فارغ ہوتے ہی خود حویلی حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ سب کو فردا فردا سلام دیتے ہوئے میری آواز کیوں بھرا سی گئی۔ کرم دین پلٹ کر چل دیا۔ اصغر صاحب اپنے کمرے میں جانے کن تیار یوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس روز قدرت نے بھی میرے ساتھ کھیلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ شاید دوپہر سے پہلے ہی گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھانچنا شروع کر دیا اور ظہر

سے پہلے وہی موسلا دھار جھڑی شروع ہوگئی جو پچھلے ایک ہفتے سے جبل پور کے پہاڑوں کو نہلا رہی تھی۔ میں نے اصغر صاحب سے بہانہ کیا کہ حویلی سے میرے لیے بلاوا آیا ہے لہذا میرا جانا ضروری ہے۔ البدن شام ہونے سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے ”جاؤ میاں جاؤ..... حویلی میں ایک نہیں دو دو پریاں جس شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں اُس کا دل بھلا ہم بوڑھوں کے ساتھ کہاں لگے گا۔ جاؤ مل آؤ..... آج جب تم لوگوں کے تب تک میں بھی آزاد ہو چکا ہوں گا..... بس دعا کرنا کہ آخری لمحے میرے قدم لڑکھڑانہ جائیں..... بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں کتنا بڑا گناہ گار ہی کیوں نہ سہی..... لیکن قتل پھر بھی مجھ سے آج تک سرزد نہیں ہوا.....“

میں نے انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے دل میں سوچا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آج بھی میں انہیں قاتل نہیں بننے دوں گا۔ میں جب درگاہ سے باہر نکلا تو اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر نہ نکل آئیں میں نے پہلے پہاڑی سے نیچے سیدھے سڑک کا ہی رخ کیا۔ جب کہ کھنڈر تک پہنچنے کے لیے مجھے اوپر کی جانب جانا چاہیے تھا کیونکہ کھنڈر سڑک سے بالکل مخالف سمت میں درگاہ کی پچھلی چوٹی کے پیچھے والی پگ ڈنڈی کی راہ اختیار کرنے سے آتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں کچھ دُور سڑک پر جا کر پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ اصغر صاحب کی نظر میں آئے بنا کھنڈر کی ڈگر تک پہنچ جاؤں لیکن براہِ واسطو فانی بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا جس نے دن کے وقت بھی گہری شام سی کر رکھی تھی۔ مجھ سے اندازے میں کچھ چوک ہوگئی اور جس وقت میں گرتے پڑتے دوبارہ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچا اُس وقت عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ سرد ہوائ نے میرا وجود برف کر دیا تھا اور بارش کی بوندیں میرے جسم میں ہزاروں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ دُور سے کھنڈر کے آثار نظر آئے تو میرے قدم مزید تیز ہو گئے۔ جانے وہ مسافر کہیں بارش سے چھپتے ہوئے مجھ سے پہلے ہی کھنڈر میں پناہ نہ لے چکا ہو.....؟ ایسے میں اُسے میں کس طرح سمجھا پاؤں گا کہ اُس کا وہاں کھنڈر میں بیٹھ کر بارش رکنے کا انتظار اُس کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے..... یا خدا..... مجھے اُس سے پہلے کھنڈر پہنچا دے۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تب بھی یہی دعا میرے لبوں پر جاری تھی۔ لیکن شاید وہ دن میری دعائیں رد ہونے کا دن تھا۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تبھی مجھے گیلی لکڑیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دُھوئیں نے کسی ذی رُوح کی موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ دُھوئیں کی چادر کے پار کوئی شخص گیلی لکڑیاں جمع کئے انہیں جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لکڑیاں سلگ کر آگ پکڑ چکی تھیں لیکن گیلی اور نم ہونے کی وجہ سے بے حد دُھواں پھینک رہی تھیں۔ اس دُھوئیں کے نیلے مرغولوں کے جھنڈ میں سے اُس شخص نے سر اٹھایا۔ میرے قدم وہیں جے کے جے رہ گئے۔ آسمان پر بجلی زور سے کڑکی اور مجھے یوں لگا کہ یہ بجلی قدرت نے براہِ راست مجھ پر ہی گرائی ہے۔ میرے سامنے سلطان بابا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ”واللہ ساحر میاں..... یہ تم ہی ہونا..... میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا..... جیسے ہی تمہارا پیغام ملا میں چل پڑا تھا۔ لیکن راستے میں بس خراب ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ رات بھر سے پہلے تو اب یہ بس ٹھیک ہوگی نہیں تو کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ لیکن بھلا قدرت اپنا زور دکھانے سے کب چوکتی ہے..... سو دیکھو..... راستے میں بو چھاڑنے آگھر اور یہاں اس کھنڈر میں پناہ لینی پڑی.....“ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا ”لیکن تم یہاں کیسے ساحر میاں..... بھیجی مان گئے تمہارے الہام کو.....“

سلطان بابا مسکرائے۔ مجھے پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے سلطان بابا سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔ یہ قدرت میرے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اصغر صاحب کو اس کھنڈر میں کسی ایک شخص کا قتل کرنا تھا اور ستم ظریفی دیکھئے کہ اس مکہ مقتول کو اپنا پیغام بھیج کر اس کھنڈر تک بلوانے والا کوئی اور نہیں، میں خود تھا۔ اور میں نے بلایا بھی کس کو تھا۔؟..... اپنے محسن، اپنے رہبر..... اپنے پیر کامل کو..... یہ مقدر کا میرے ساتھ ایک بھیاں تک مذاق نہیں تو اور کیا تھا۔؟..... مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا سے کیا کہوں۔ میرے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ”آپ یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔ یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے۔۔۔۔۔ کوئی شخص آپ کی جان کے درپے ہے۔۔۔۔۔“

”کیا کہہ رہے ہو میاں..... بھلا ہم درویشوں کی جان لے کر کسی کو کیا ملے گا.....“

میں زنج سا ہو گیا۔ ”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں یہاں آپ کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میرا پیغام آپ تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں..... میں تو یہاں اس اجنبی شخص کو بچانے کے لیے آیا تھا جسے یہاں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔“ میں نے جلدی جلدی انہیں اپنے جبل پور آنے سے لے کر آج تک کی ہر بات بتادی کہ کس طرح چھلا وہ اصغر صاحب کی آزادی کے بدلے اُن سے یہاں کسی کے قتل کا وعدہ لے بیٹھا ہے اور اصغر صاحب اب یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ سلطان بابا نے اطمینان سے میری ساری بات سنی اور سکون سے بولے۔ ”ٹھیک ہے ساحر میاں..... اگر میری آخری سانس یہیں لکھی ہے تو پھر اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آنے دو تم اپنے اس چھلاوے کو..... میں بھی تو دیکھوں کہ.....“

ابھی سلطان بابا کی بات اُن کے منہ میں ہی تھی کہ اچانک پیچھے سے کوئی زور سے چلایا ”عبداللہ.....“

میں گھبرا کر پلٹا تو دھلتی شام کے سائے میں میں نے اصغر صاحب کو وحشت بھرے انداز میں ہاتھ میں وہی چاقو لیے کھڑے دیکھا۔ یہ اصغر صاحب اُس درگاہ والے نرم خواص صاحب سے قطعی مختلف تھے اور اُن کی آنکھوں سے میں نے غصے کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ وہ پھر سے گرے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ جگہ آج کسی کا قتل بننے والی ہے۔ پھر بھی تم یہاں چلے آئے..... بڑی حماقت کی تم نے..... اب بھی وقت ہے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے.....“

میں اُن کی جانب سے پلٹا۔ ”نہیں نہیں..... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ میرے سلطان بابا ہیں۔ انہیں میں نے ہی درگاہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ نہیں جس کا آپ کو انتظار ہے.....“ اصغر صاحب کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔ اندھیرے میں بجلی زور سے چمکی اور کھنڈر کی منڈیر پر، میں نے تلکے اندھیرے میں وہی دو آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں۔ وہی شخص منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جسے میں اس سے پہلے ٹرین اور پھر درگاہ کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

”نہیں..... یہ وہی ہے جس کا آج خاتمہ ہونا اٹل ہے۔ دیر مت کرو اصغر..... تمہارا شکار تمہارے سامنے ہے۔ اس لڑکے کی پرواہ نہ کرو..... یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... آگے بڑھ کر وار کرو..... تمہاری آزادی تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے.....“ میں جلدی سے آگے بڑھ کر

سلطان بابا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”خبردار..... ان کی جانب بڑھتی ہر چیز کو پہلے مجھے پار کرنا ہو گا۔“

وہ زور سے چلایا ”دیر مت کرو اصغر..... اس لڑکے کو بھی راستے سے صاف کر دو..... خس کم جہاں پاک.....“

سلطان بابا سکون سے اپنی جگہ پر کھڑے اپنی مخصوص تسبیح گھمار رہے تھے، وہ مجھے بنا کر میرے سامنے آگئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

”جس کی جان کا سودا طے کیا جا رہا ہے کوئی اُسے بھی تو بتائے کہ مول کیا لگا ہے؟ مجھے کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا لگاڑا ہے؟“

چھلا وہ جواب کو دکر دوسری منڈیر پر بیٹھا غصے سے ہمیں گھور رہا تھا، چلا کر نفرت سے بولا۔ ”زیادہ بھولے نہ بنو..... تم خوب جانتے ہو کہ

تمہاری اور میری دشمنی تو ازل سے ہے..... صدیوں سے تم میرا راستہ کاٹنے آئے ہو۔ کبھی مذہب کی صورت میں، کبھی نیکی کی صورت میں، کبھی اچھائی

کی صورت میں۔ آغاز سے ہی تم نے میرا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی ہے..... لیکن آج میں تمہاری سانسیں بند کر کے یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر

دوں گا۔ آج میری وہ پہلی جیت ہوگی جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔“

سلطان بابا کے لہجے میں اب بھی ٹھہراؤ تھا۔ ”تم صدیوں کی بات کر رہے ہو..... جب کہ میں تو ایک عام انسان ہوں جس کی عمر فقط چند

سال ہے، پھر تم کس سے اب تک لڑتے آ رہے ہو۔ ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہو گا۔“

چھلا وہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے نفرت سے ہونٹ سکڑے۔

”نہیں تم وہی ہو..... بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہارا اس بوسیدہ جسم سے کیا لینا دینا..... میں تو تمہاری اس روح کو

ختم کرنا چاہتا..... ہمیشہ کے لیے..... اصغر تم وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ گے۔ کیا تمہیں

آزادی نہیں چاہیے..... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... یاد رکھو..... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر

میں ساری زندگی تم پر مسلط رہوں گا..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے..... ساری زندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے

گی۔ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے گی۔“

اصغر صاحب شدید کشمکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے لگے، میں زور سے چلایا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے

ہیں..... رک جائیں۔“ چھلا وہ نے غصے اور نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا

ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم جیسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت

سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟ اور پھر اگر یہ اسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری

زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ خود آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اسے تمہارے کمزور انسانی بازوؤں کی

ضرورت کیوں پیش آرہی ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کر دانے کے بہانے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے.....“

دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر لو۔۔۔۔۔ تھوڑا سوچ لو مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے۔۔۔۔۔ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔۔۔۔۔ یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔“

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رُکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔ ”پاگل مت بنو اصغر۔۔۔۔۔ اس شخص کی چکنی چڑی باتوں میں مت آنا۔۔۔۔۔ یہ جادو گر ہے۔۔۔۔۔ تمہاری تباہی کے درپے ہے۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں ہی تمہارا واحد دوست ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟۔۔۔۔۔ جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ۔۔۔۔۔ جاؤ اس کے سینے میں یہ چاقو گھونپ دو۔۔۔۔۔ اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو۔۔۔۔۔ ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا۔۔۔۔۔ چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔“

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم بڑھا دیئے کہ ”میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اسی میں میری نجات ہے۔“ چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہری اُٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو۔۔۔۔۔ لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے۔۔۔۔۔ کیا اگلے جہاں میں تمہارا بھی اس عفریت کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔ یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اسے تم جیسے معصوم انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اکساتا ہے۔“ اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تعنی سے ہنسے ”معصوم۔۔۔۔۔؟ اور میں۔۔۔۔۔؟ تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی حرمت خراب نہ کرتے۔۔۔۔۔ دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے مرز نہیں ہوا۔ اگلے جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید زندگی ہی آرام سے کٹ جائے۔“

سلطان بابا اگر بے ”کنتاجی“ لوگے مزید تم۔۔۔۔۔ اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون سے ہی کٹے گی؟۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ ایک گناہ اب بھی ایسا ہے جو تم نے اب تک نہیں کیا۔۔۔۔۔ قتل۔۔۔۔۔ کیا کسی معصوم انسان کے قتل کا بوجھ اپنے سر پر لے کر تم واقعی سکون کی زندگی ہی پاؤ گے؟۔۔۔۔۔ کیا ضروری ہے کہ تم یہ آخری گناہ بھی اپنے کھاتے میں لکھوا کر ہی اوپر جاؤ۔۔۔۔۔ تو بہ اور معافی کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔ تمہارے گناہوں کا کوئی شمار کوئی حد ہو سکتی ہے۔ لیکن اُس کی رحمت بے شمار اور لامحدود ہے۔۔۔۔۔ اب بھی وقت ہے۔۔۔۔۔ تمہاری سانسیں ابھی باقی ہیں۔۔۔۔۔ ان کے ختم ہونے سے پہلے اُس کے دربار میں ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگ لو۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں معاف کر دے گا۔۔۔۔۔ اور تمہارے پاس تو کفارہ ادا کرنے کا بھی موقع ہے۔۔۔۔۔ سچے دل سے توبہ کر کے اس بدی کے ہر کارے کی بات ماننے سے انکار کر دو۔۔۔۔۔ شاید تمہیں قدرت نے آج اس مقام پر اسی لیے پہنچا دیا ہے کہ تم اپنی گناہوں بھری زندگی کا خود خاتمہ کر لو۔“

بارش کی بو چھاڑ تیز ہو چکی تھی اور بجلی اب یوں کڑک کڑک کر ارد گرد گر رہی تھی جیسے آج اُسے بھی اپنے کسی شکار کی تلاش ہو۔ اصغر صاحب کا اٹھتا ہوا ہاتھ اٹھتے اٹھتے پھر درمیان میں رک گیا۔ چھلا وہ زچ ہو کر غصے سے پاگل ہو چکا تھا اور سلطان بابا کی گفتگو کے دوران وہ درجنوں بار اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہو گیا تھا وہ چلا کر بولا۔

”بس بہت ہو چکا یہ کھیل اصغر تم اس کا خاتمہ کرتے ہو، یا میں اپنے اسی سرخ دھاگے کو تمہارے گلے کا پھندا بنا ڈالوں ہمیشہ کے لیے.....“

میں اب پل بھر بھی انتظار نہیں کروں گا واپس پلٹنے میں..... مار ڈالو اسے..... گھونپ ڈالو اس کے سینے میں یہ چاقو..... ابھی..... میں کہتا ہوں ابھی.....“

اصغر صاحب جو شاید اس قتل کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ اُنہوں نے چھلا دے کی دھاڑ سے ڈر کر چاقو والا ہاتھ یوں فضا میں بلند کیا جیسے وہ اس بحث کے دوران ہزار بار ٹوٹ کر نکھر چکے ہوں۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اصغر صاحب کے ہاتھ میں پڑے چاقو کا پھل دُور کہیں گرتی بجلی کی روشنی سے پل بھر کے لیے جگمگایا اور پھر فضا میں سلطان بابا کی آواز گونجی ”لا الہ الا اللہ.....“

اصغر صاحب کا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا میرے منہ سے ”نہیں“ کی چیخ نکل گئی۔ اصغر صاحب کے تیزی سے نیچے آتے چاقو کے پھل نے اُن کی گردن میں پڑے دھاگے کو اس طرح کاٹا کہ خود اُن کی گردن سے بھی خون کا ایک تیز فورہ سا نکلا جس نے سامنے کھڑے سلطان بابا کو رنگ ڈالا۔ اصغر صاحب نے سلطان بابا کے سینے میں چاقو گھونپنے کے بجائے اپنے ہی گلے میں پڑے سرخ دھاگے کو کاٹ ڈالا تھا۔ اُن کا وار چھٹتا ہوا پڑا اور چونکہ دھاگا گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا تھا لہذا چاقو نے دھاگے کی کسی ہوئی ڈور تک پہنچنے سے پہلے اُن کے گلے کی جلد کو کاٹ ڈالا۔ دفعۃً بجلی زور سے کڑکی اور پھر فضا میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور میں نے اس گھپ اندھیرے میں برستی ہو چھاڑ کے پس منظر میں اُن دوسرے جلتی آنکھوں کو رفتہ رفتہ معدوم ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایسے جیسے کوئی دو جلتے ہوئے شدید تیز انگاروں پر پانی کی ہلکی ہلکی بوندیں گرا کر انہیں دھیرے دھیرے بجھا دے۔ میں ابھی تک انہی آنکھوں کے سحر میں تھا کہ سلطان بابا کی زور دار آواز نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ”ساحرمیاں..... جلدی کرو..... ابھی جان باقی ہے..... اسے کسی ہسپتال تک پہنچانا ہوگا.....“

میں ایک دم سے جیسے ہوش میں آ گیا۔ اصغر صاحب زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے گلے سے بھل بھل خون نکل کر پانی کے قطروں کے ساتھ مل کر نیچے کچھڑ میں مل رہا تھا۔ سلطان بابا نے جلدی سے اپنے کاندھے پر پڑی چادر کو پھاڑا اور ایک پٹی سی بنا کر اصغر صاحب کے زخم پر خوب کس کر مضبوطی سے باندھ دی۔ قریب ہی کچھڑ میں لت پت پڑے اُس سرخ دھاگے کو انہوں نے اس سمجھتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جو انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے کھنڈر میں روشن کر رکھی تھی۔ دھاگا جل کر یوں تڑخا جیسے کوئی جڑی بوٹی آگ میں جلی ہو۔ میں نے اصغر صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور ہم دونوں تیزی سے کھنڈر سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتی کچی سڑک کی جانب دوڑ پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے اصغر صاحب کے گلے سے چپکتے ہوئے خون کے قطرے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ

ہم خوابوں کے یو پاری تھے

پراس میں ہوا نقصان بڑا

کچھ بخت میں ڈھیروں کا لک تھی

کچھ اب کے غضب کا کال پڑا

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

**or
send message at
0336-5557121**

راکھ لیے جھولی میں

اور سر پر سا ہو کار کھڑا

جب بستی صحرا صحر اُتھی

ہم دریادریاروئے تھے

جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں

اور سر سنگیت میں کھوئے تھے

تب ہم نے جیون کھیتی میں

کچھ خواب انوکھے بوئے تھے

جب فضل کئی تو کیا دیکھا

کچھ زخمی خواب تھے آنکھوں میں

کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے

پراس میں ہوا نقصان بڑا



ڈاک کام

خواب مرتے نہیں

آخر کار تیسرے دن اصغر صاحب کو ہوش آ ہی گیا۔ ہم اُس طوفانی رات میں انہیں کس طرح لے کر پہلے گاؤں کے ہسپتال اور پھر خان صاحب کی گاڑی میں قریبی ضلع کے بڑے ہسپتال تک پہنچے یہ ایک الگ اور لمبی داستان تھی۔ پہلے تو ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا، لیکن پھر نہ جانے یہ اُن کے اندر کے جینے کی لگن تھی، یا پھر واقعی اُن کا کفارہ ساتویں آسمان پر قبولیت کا شرف پا گیا تھا۔ ہماری دعائیں رنگ لے آئیں اور اصغر صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے چند گھنٹے تو ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری تھے۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس ہسپتال تک کیسے پہنچے۔ پھر دھیرے دھیرے انہیں اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی۔ سلطان بابا نے اُن کی اس کیفیت کی ایک بہت حیرت انگیز سی وجہ بھی بیان کی کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد اصغر صاحب کو چھلاوے کے ساتھ گزرا ایک سال صرف چند لمحوں کا خواب لگا، یا انہیں کچھ بھی یاد نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہمارے زمینی وقت کے محو سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ”زمینی وقت سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا مختلف زمانوں کے لیے وقت کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں؟“ سلطان بابا نے گہری سی سانس لی۔ ”فی الحال تو یہ صرف ایک پیمانی ہی ہے۔ اور سائنس بھی کہیں نہ کہیں اس پیمانی کی کھوج میں ہے۔ لیکن نوری سال (Light Year) اور وقت میں سفر کا تصور اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ ہم زمین پر جس وقت کے پیمانے میں زندہ ہیں اس کے علاوہ وقت کے مزید پیمانے بھی ضرور موجود ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہماری گھڑی، پل، منٹ، گھنٹے اور سیکنڈز بھی ان زمانوں کے وقت کے پیمانوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ مثلاً ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اصغر صاحب نے اُس مخلوق کے زیر اثر جو ایک سال گزرا وہ ہماری دنیا کا صرف ایک منٹ، یا چند سیکنڈ ہی ہوں۔ مثلاً ہم خواب میں اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی زندگی کے تمام مناظر دیکھ کر بھی جب اُٹھتے ہیں، تو ہماری پوری نیند میں اس دیکھے گئے خواب کا اصل دورانیہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ مطلب خواب میں وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور سالوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ گویا خواب کے وقت کا پیمانہ جاگتی حالت کے پیمانے سے یک سر مختلف ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح کسی زمانے کے وقت کا پیمانہ ہمارے زمانے کے بالکل الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم یہاں زمین پر جس وقت کو سالوں میں پورا کر پاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ کسی زمانے کا ایک پل ہی ہو۔۔۔۔۔ یہ سب کہیں نہ کہیں مینافز کس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہی سارے وہ اسرار ہیں جن کی کھوج کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔“

میری اُلجھن ابھی تک قائم تھی۔ ”لیکن اصغر صاحب کے معاملے میں صرف وہی تو اس وقت کے پیمانے میں شامل نہیں تھے، اُن کے ساتھ اُن کی بیوی، بچے، دوست، دشمن، باہر کی دنیا اور دفتر والے سینکڑوں لوگ شامل تھے، جن سے پورا سال اصغر صاحب کا تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ ہم اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ اصغر صاحب ایک خواب کی حالت میں اس چھلاوے کی دنیا کے وقت کے پیمانے کے زیر اثر اپنا پورا سال گزار کر یہاں

تک پہنچے ہیں تو پھر باقی لوگوں کی کیفیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر اُن کے آخری تیس دن تو خود میرے ساتھ درگاہ پر ہی گزرے ہیں اور آخری دن کے چند گھنٹے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس وقت کے پیمانے میں شامل تھے..... اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“ سلطان بابا ابھی تک اُسی گہری سوچ میں تھے۔ ”اسی لیے میں نے کہا تھا نا کہ ابھی تک یہ ایک پہیلی ہی ہے اور پھر تم بھول رہے ہو کہ انسان جب نیند میں چلتا ہے تو اُس کے ارد گرد کا زمانہ جاگ ہی رہا ہوتا ہے اور پوری طرح اپنے حواس میں ہوتا ہے۔ اگر اصغر صاحب نیند میں تھے تو ہم بھی اُن کے خواب کے چند کردار بن کر اُن کے ساتھ چلتے رہے۔ اس سے اُن کی خوابیدہ حالت کا کیا تعلق.....؟“ ”چلیں مان لیا کہ اصغر صاحب خواب کی کیفیت میں ہی تھے لیکن پھر اس چھلاوے کی وہ شبیہ.....؟ اُس کی وہ دو جلتی ہوئی آنکھیں.....؟ جو میں نے اور پھر آپ نے بھی خود دیکھیں ہیں..... اُس کی آپ کیا توجہ یہ پیش کریں گے.....؟“

سلطان بابا میری تکرار سن کر مسکرا دیئے۔ انہوں نے تو صنفی نظر سے میری جانب دیکھا ”ہاں..... یہ البتہ مکمل سوال ہے۔ جس کی توجیہ بہ کی ضرورت ہے..... تمہیں یاد ہے کہ یا قوط نے رُباب کو تمہیں زہرا کے روپ میں دکھایا تھا؟..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بار ہم دونوں ہی اُسی طرح کے کسی خواب کے زیر اثر رہے ہوں لیکن بہر حال یہ بات طے ہے کہ اصغر صاحب کا واسطہ واقعی ایک شیطانی مخلوق سے قائم تھا..... اس مخلوق کے اثرات اور اس کے وقت اور دیگر بیانیوں کا تو اب تب ہی پتا چلے گا جب اصغر صاحب کو مکمل ہوش آئے گا.....“

اور پھر دھیرے دھیرے اصغر صاحب کو مکمل ہوش آ ہی گیا اور ساتھ ہی انہیں پچھلی ساری باتیں بھی یاد آ گئیں۔ انہیں واقعی اپنا پچھلا گزرا پورا سال ایک خواب ہی لگ رہا تھا لیکن وہ سب خواب نہیں تھا۔ انہوں نے جب ہسپتال کے نمبر سے اپنے نئے گھر کا نمبر ملایا تو وہاں سے واقعی اُن کے نوکر نے ہی فون اٹھایا لیکن اُس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اصغر صاحب جانے سے پہلے اس قدر دیوالیہ ہو چکے تھے کہ اُن کے تمام کاروبار، گھر اور روپیہ پیسہ گروی ہو چکا تھا اور تین دن پہلے اس رہن کی معیاد ختم ہونے کے بعد بینک اور باقی سود خور جن سے قرضہ لیا گیا تھا، وہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب اصغر صاحب نے اپنے گلے میں پڑا دواہا گا کاٹ ڈالا تھا۔ گویا عین اُس لمحے جب اصغر صاحب اپنا گروی رکھا ہوا ایمان واپس پارہے تھے، ٹھیک اُسی وقت اُس رہن رکھے ایمان کے بدلے پانی ہوئی سلطنت کو وہ کھورہے تھے۔ چھلاوہ اپنی دی ہوئی دنیاوی آسائشوں کو تخت و تاراج کر رہا تھا اور آج ٹھیک ایک سال بعد مالی طور پر اصغر صاحب وہیں کھڑے تھے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ البتہ رشتوں کے معاملے میں انہوں نے صرف اور صرف کھویا ہی تھا۔ اُن کا سارا خاندان برباد ہو چکا تھا اور اُس ایمان فردوسی کی قیمت اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے بدلے انہیں ساری عمر چکانا تھی۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ بظاہر اُن کے اس عروج و زوال کی کہانی کا اسکرپٹ پوری طرح مکمل کر رکھا تھا اُس چھلاوے نے۔ عام لوگوں کے لیے یہ معاملہ بہت سیدھا سا دھاتھا۔ ایک عام جوئیر کلرک جو اپنے دو کمروں کے چھوٹے فلیٹ میں عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا، ایک دن اُس کا پانچ کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آتا ہے اور وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس پیسے کو اسٹیٹ اور پرائیویٹ کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ قسمت یہاں بھی اُس کا ساتھ دیتی ہے اور اُس کا زمین کے لین دین کا کاروبار دنوں دنوں رات چوگنی ترقی کرتا ہے اور وہ ایک بہت بڑی بزنس ایسپائرٹ کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن اُس کا بیٹا اور داماد قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر

پھانسی تک جا پہنچتے ہیں اور یہاں سے اُس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ بیوی، بیٹے کی موت کی خبر سن کر ہوش و ہواس کھو بیٹھی ہے۔ بیٹی بیوہ ہو جاتی ہے۔ دوسری بیٹی کسی غنڈے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور وہ کروڑ پتی بیٹے اور داماد کو پھانسی سے بچانے کے چکر میں اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اپنی ساری جائیداد گروی رکھ کر سود پر بازار سے قرضہ اٹھاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مقدر اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ بیٹا پھانسی چڑھ جاتا ہے اور وہ شخص دیوالیہ ہو کر ایک دن دنیا کی نظروں میں گھر سے بھاگ کر کہیں چھپ جاتا ہے اور اسی اثناء میں بینک اور سود پر پیسہ دینے والے مدت ختم ہونے کے بعد اُس کے گھر، جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ شخص پھر سے غربت کے اُسی گڑھے میں جا گرتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے یہ بس اتنی ہی اور سیدھی سادھی سی کہانی تھی۔ اُس پاس کے لوگ اصغر صاحب کی بد قسمتی پر کچھ دیر کے لیے بحث کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ چند ہفتوں کے بعد یہ کہانی بھی اُن کے ذہنوں سے مٹ جائے گی۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ اصغر صاحب کے اس عروج اور زوال کی داستان کے پیچھے ”چھلاوے“ نامی کسی مخلوق کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مارڈرن سائنسی دور میں کس کے پاس فرصت ہے ایسی طلسماتی داستانوں پر یقین کرنے کی؟..... میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور عجیب سا خیال آیا، ہمارے اُس پاس جانے کتنے لکھ پتی کنگلے اور جانے کتنے کنگلے راتوں رات لکھ پتی بن جاتے ہیں..... کون جانے ان کامیابیوں اور بربادیوں کے پیچھے بھی کسی اُن دیکھے ”چھلاوے“ کا ہاتھ ہی نہ ہوتا ہو؟ ہم اپنی کامیابیوں کی راہ پر اپنی بے ایمانی اور ایمان فروشی کے ایسے ہی گھوڑے سر پٹ دوڑاتے جاتے ہیں اور اپنی ہر فتح کو اپنی حکمت اور اپنی منصوبہ بندی کا مہولہ منت مان کر جیت کے نشے میں ہر سہرا اپنے سر باندھتے ہوئے یہ بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ کہیں یہ ”بے ایمان“ کامیابیاں، قدرت کی کسی ڈھیل کا نتیجہ تو نہیں.....؟ کہیں کوئی ”چھلاوہ“ ہمارے ارد گرد اپنا جال تو نہیں بن رہا؟ ایک ایسا جال جس کی ڈوریاں خود ہماری ایمان فروشی کے دھاگوں سے بنی ہوئی ہیں اور جب بھی ذرا ہمارے اندر ایمان جا گا وہ چھلاوہ ہمارے قدموں تلے سے زمین کھینچ کر پھر سے ہمیں بے دست و پا کر دے گا.....

ٹھیک اُسی طرح جیسے اُس نے آج پل بھر میں اصغر صاحب کو آسمان سے اٹھا کر پھر سے اُسی زمین پر بیچ دیا تھا جہاں سے وہ ترقی اور دولت کی خواہش لے کر اُٹھے تھے۔ پوری حالت سنبھلنے کے بعد انہوں نے مجھے اور سلطان بابا کو بتایا کہ جس وقت انہوں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تھا اُس وقت تک اُن کا صرف اور واحد ارادہ وہ چاقو سلطان بابا کے سینے میں اُن کے دل کے اندر گاڑ دینے کا ہی تھا، لیکن جیسے ہی اُن کا ہاتھ بلند ہوا اور سلطان بابا کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر لا الہ الا اللہ کا کلماتی کلمہ ادا ہوا تو پل بھر میں ہی جانے اُن کے اندر سب کچھ تلپٹ کیسے ہو گیا اور انہوں نے خود اپنی شرگ پر ہی وار کر دیا۔ بقول اُن کے اگر خیر اُٹھانے سے پہلے ہی اُن کا ارادہ دھاگا کاٹ دینے کا ہوتا تو وہ ہاتھ کو سر سے بلند ہی نہ کرتے اور سیدھے اپنی گردن کی جانب لے جا کر دھاگا کاٹ ڈالتے۔ اور اس صورت میں شاید اُن کی گردن بھی اس قدر نہ کنتی جتنی اس طرح اُوپر سے وار کرنے کی صورت میں کئی۔ اپنی جانب سے تو وہ اپنا خاتمہ کر ہی چکے تھے، لیکن قدرت کو ابھی اُن کی زندگی، یا یوں کہہ لیں کہ اُن کا امتحان مزید مقصود تھا لہذا تین دن زندگی اور موت کی بازی کھیلنے کے بعد وہ پھر سے زندگی کی جانب پلٹ آئے۔ سلطان بابا نے اُن کی پوری بات سن کر سر اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور دھیرے سے بولے ”بے شک! اللہ کے کلمے میں بڑی طاقت ہے۔ کاش ہم سب اس کلمے کی اصل طاقت اور اثر سے پوری طرح واقف ہوتے تو کسی اور اسمِ اعظم کی

تلاش میں یوں در بدر نہ بھٹکتے۔ جو کچھ بھی ہے اسی کلمے میں پنہاں ہے۔۔۔۔۔“

میں اصغر صاحب کی بے ہوشی کے وقفے میں تین دن تک سلطان بابا کے ساتھ ہی بنا پلک جھپکائے ہسپتال میں اصغر صاحب کے سر ہانے بیٹھا رہا تھا۔ اُن کی طبیعت کچھ سنسنیلی تو سلطان بابا نے اصرار کر کے مجھے حویلی کی خبر لینے کے لیے گاؤں بھیجا کہ زہرا اور اُس کی ماں صرف میرے بلاوے پر اتنی دُور آئے ہوئے تھے لہذا مجھے اُن کی دل جوئی کے لیے ہی سہی، پر حویلی کا ایک چکر ضرور لگا آنا چاہیے۔ حالانکہ جب ہم اصغر صاحب کو کریم خان صاحب کی موٹر میں ضلع کے بڑے ہسپتال کے لیے لے کر نکل رہے تھے تب میں نے بڑی مالکن کے ذریعے زہرا کو یہ پیغام بھجوادیا تھا کہ ”پریشانی کچھ ایسی ہے کہ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔“ اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں جن اعلیٰ ظرف لوگوں کے درمیان زہرا اور اُس کی ماں کو چھوڑے جا رہا تھا وہ اپنا سب کچھ لٹا دیں گے لیکن کبھی اپنے مہمانوں کے شیشہ دل پر کوئی بھی خراش نہیں آنے دیں گے۔ لیکن خود اُن کے اپنے گھر میں اُن کے اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی تو متضلل تھا، زخمی تھا، بے کل تھا۔۔۔۔۔ جانے وہ اُس موم کے پروں والی پری کی اس آنچ سے حفاظت کیسے کر پائے ہوں گے؟ وہ تو اتنی نازک تھی کہ بادلوں سے چھنی ایک ہلکی سی کرن بھی اُس کا اندر پگھلا سکتی تھی۔ پھر جانے یہ تین دن کا سورج اُس پر کیسے برسا ہوگا؟ ہاں البتہ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ میں زہرا نام کا جو اُبر اُس نازنین کے پہرے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا وہ خود اپنے وجود میں لاریب کے حصے کی ہر تپش برداشت کر لے گا لیکن اُس کا کوئل سن کبھی پٹھلے نہیں دے گا۔ انہی سوچوں میں گم جب میں ضلع سے صبح کی پہلی ٹرین لے کر دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے جبل پورا اسٹیشن پر اُترا اور حویلی پہنچا تو سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ بیرونی ڈیوڑھی میں کرم دین نے مجھے آتے دیکھا تو اندر اطلاع کرنے کے لیے دوڑ گیا۔ اور کچھ ہی بل میں اُلٹے قدموں لوٹا کہ مجھے اندر بلا لیا گیا ہے۔ حالانکہ میں درجنوں باریہ ڈیوڑھی پار کر کے حویلی کے اندر جا چکا تھا لیکن آج بھی میرے قدموں میں وہی جھجک اور وہی چٹکچٹاہٹ تھی جو پہلی باریہ دہلیز پار کرتے ہوئے ملو جود تھی۔

اندر زانے والے حصے کے برآمدے کو بڑی بڑی چکوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ شاید یہ اہتمام سخت گرمیوں کے موسم کے لیے کیا گیا ہو، تاکہ دوپہر کی تپتی دھوپ کی تپش کو روکا جاسکے۔ لیکن اس سرما کی نرم دھوپ والی سہ پہر میں بھی ان لکڑی کی کھلے ٹکوں والی چکوں کا یوں ڈھلکا رہنا ضرور کسی خاص وجہ سے ہی ہو سکتا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ اہتمام زہرا اور اُس کی امی کی وجہ سے کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ بہر حال وہ دونوں حویلی کے آبائی نوکروں کے سامنے بھی یوں آزادانہ پھرنے میں کچھ جھجک ضرور محسوس کرتی ہوں گی۔

باہر سے چھن کر آنے والی دھوپ چک کے ٹکوں کے درمیان سے کچھ ایسے زاویے سے برآمدے کے چمکیلے سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہی تھی کہ نیچے فرش پر بھی دھوپ کے ٹکوں کی ایک ”چمک“ سی بچھ گئی تھی۔ ایک عجیب سا نیلا اُجالا پھیلا ہوا تھا اس طویل برآمدے میں۔ لہذا میری آنکھوں کو کچھ بل گئے اس ملگجی روشنی سے نظریں ملانے میں۔ برآمدے کے آخر میں موچے کی لمبی لمبی بیلوں کے سامنے کوئی پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر وہ وجود پلٹا۔ میری آنکھیں تب تک اس مدہم روشنی سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ لاریب تھی، سفید کرتے پا جامے میں ملبوس اور سر پر دھانی رنگ کی اوڑھنی لپے ہوئے۔ وہ نور کا ایک ایسا ہالہ لگ رہی تھی جس کے اندر ذرا سی ہلدی کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ شاید اس شدید بخار اور بیماری کا اثر تھا جو اُس کے دلچ چہرے پر پچھلے چند دنوں کے دوران اپنا رنگ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی ستارہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ میں نے سلام کے بعد

اُس سے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھنے سے پہلے اُس کی طبیعت کا پوچھا، وہ دھیرے سے مسکائی ”آپ نے طیب ہی ایسا بھیجا تھا کہ بیماری کو نہ کہتے ہی بنی..... اتنے اچھے لوگ بیک وقت اپنے اُس پاس کیسے جمع کیے رکھتے ہیں آپ.....؟..... میں تو ہر بار کھودیتی ہوں۔“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، جانے یہ بات اُس نے کس رو میں کہی تھی، یا واقعی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا بھی خوب جانتی ہیں۔ ہتھیلی پر نام لکھ کر پلکوں سے مناتی رہتی ہیں۔ لیکن آنکھ کے پردے تک وہ تحریر آنے نہیں دیتیں۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو لاریب نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں کسی منگنی کی تقریب میں بڑی مالکن کو بطور لڑکی کی سرپرست دعوت تھی۔ لہذا وہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ زہرا اور اُس کی ماں کو بھی تبدیلی کی غرض سے لے گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میں اور لاریب بالکل ہی خاموش کھڑے رہے۔ جیسے ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی ہو، یا ہم دونوں ہی جیسے اُس مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں خاموشی خود ہر بات کہہ دیتی ہے۔ اور زبان، لفظ اور باتیں سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ میں نے دلپس کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ ”مجھے آپ سے معذرت کرنا تھی.....“ میں چونک کر پلٹا ”معذرت..... لیکن کس بات کی.....“ اُس نے اپنی پلکوں کی جھار گرالی۔ ”میں انجانے میں آپ کو اپنے زخموں میں الجھا بیٹھی..... آپ تو خود شدید گھائل ہیں..... آپ کے تو اپنے زخموں سے ابھی خون رسا بند نہیں ہوا..... آپ کی امی نے آپ کی اور زہرا کی کہانی اتنی تفصیل سے نہیں سنائی تھی۔ اگر میری زہرا سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید آپ کے داغوں پر پڑا یہ پردہ میرے سامنے کبھی اُٹھ نہ پاتا۔ آپ تو ہر حد سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے آج تک محبت کو جیتنے اور لوگوں کو محبت میں ہارتے ہوئے ہی دیکھا تھا..... لیکن آپ نے محبت کو جیت کر دکھا دیا..... زمانے کی ہر رسم، محبت کی ہر شرط، مجبوری کا ہر دعویٰ آپ کے سامنے فقط ریت کی ایک دیوار ہی تو ثابت ہوا۔ آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ جو عشق میں جی نہیں سکتے وہ پہلے ہی سے مرے ہوتے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں ہوں کہ وہ ذہن میں اُن کی ترتیب جوڑتے جوڑتے اپنے لفظ ہی بھلا بیٹھی ہو۔ لاریب نے اپنے دھوکئی جیسے چلتے سانس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جانے یہ جذبوں کی بھول بھلیاں ہم کمزور انسانوں کے ساتھ ایسے گھناؤنے کھیل کیوں کھیلتی ہیں کہ ہم کچھ کہتے ہیں تو رسوا ہوتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں تو لفظوں کے یہ ڈنگ ہمیں اندر ہی اندر ڈستے رہتے ہیں۔ اور آخر کار چپ کا یہ ناسور ہماری جان لے کر ہی رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال سے اس وقت وہ کالج کا پیکر بھی دوچار تھی۔ میں نے کھنکار کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ ”اپنی اپنی تقدیر کی بات ہے..... میری ہمیشہ یہی دعا رہے گی کہ قدرت آپ کی راہ میں کانٹوں کی جھگی ہر راہ کو لگوں سے بھر دے.....“

اُس نے اپنی پلکیں اٹھائیں ”پھولوں کی خواہش تو میں نے بھی کبھی نہیں کی..... اور پھر ان راہوں کے چناؤ کا انتخاب خود ہمارے بس میں ہوتا ہی کب ہے کہ ہم کلیں، یا کانٹوں کے فرق کو دھیان میں رکھتے ہوئے کسی راستے کو چن کر اپنا پہلا قدم وہاں رکھیں..... ہمیں تو پتا ہی تب چلتا ہے جب ہمارے پاؤں چھل چکے ہوتے ہیں.....“

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی پاؤں کے چھالوں کی دُہائی دے رہی تھی۔ میں اب اُس گل اندام کو یہ کیسے سمجھاتا کہ یہ تو وہ راہ ہے جہاں پیر کے چھالے گھٹنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ میرے مقدور میں تو خارا زل سے لکھ دیئے گئے تھے مگر وہ اپنی گلابیوں جیسی کوئل جلد لیے اس خارزار کی

طرف کیوں بڑھی چلی آ رہی تھی؟ اُس کے جگر ناتواں کے لیے تو یہاں کا صرف ایک زہریلا کاٹنا ہی کافی تھا۔ میں سر جھکائے جانے ایسی کتنی سوچوں سے لڑتا رہا۔ پر شاید وہ بھی سوچ بڑھنے کا ہنر جانتی تھی۔ جس کا ثبوت اُس کے اگلے جملے نے دے دیا۔

”لیکن آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیے گا۔ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے کہ یہ وہ بازی ہے جو ہار کر ہی جیتی جاسکتی ہے۔ یہ وہ ملن ہے جو جدائی کے بنا مکمل نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کھوکھری پایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جو اجڑ کر ہی ہستی ہے۔ یہ وہ حیوان ہے جو خود کو مار کر ہی جیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ سردسوں ہے جس کی ٹھنڈک انگاروں پر چل کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔ تو میں نے بھی ان چند دنوں میں اُس عجائب خانے کو برتنے کا کچھ نہ کچھ ڈھنگ سیکھ لیا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ میں نے ہر درد پر عبور حاصل کر لیا ہے لیکن اتنا وعدہ آپ سے ضرور کرتی ہوں کہ میرے اندر اس جذبے سے جو بھی تبدیلی آئے گی، وہ اس اعزاز کی حرمت کی تحقیر کا باعث کبھی نہیں بنے گی۔ میں ہمیشہ سراسر اٹھا کر جیوں گی تاکہ میری وجہ سے کبھی محبت کا سر جھکے نہ پائے۔۔۔۔۔ بس مجھے ہر قدم پر آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی کہ میں ابھی بہت کمزور ہوں اور میرے ظرف کا پیمانہ بھی ابھی اتنا گہرا نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے ٹھیک طرح سے ٹوٹنا بھی نہیں آتا جب کہ مجھ سے خود ہی اپنے ریزے سیٹیلے کی اُمید بھی باندھی جا چکی ہے۔ دعا کریں کہ میں ثابت قدم رہ سکوں۔۔۔۔۔“ وہ چپ ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے لفظ بھی اُسی کے پاس رہ گئے ہیں۔ گویا قدرت نے ایک بار پھر کوہ کن کے ہاتھ ایک چھوٹا سا تیشہ تھا کر اُسے زندگی کے پتھر پیلے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ میں اُس نازک سی لڑکی کے الفاظ اور اُن سے پیدا شدہ مدد و جزر پر غور کرتا رہا۔ یہ محبت بھی کتنی بڑی استاد ہوتی ہے۔ نہ جانے چند دنوں میں ہی یہ ہم معصوم انسانوں کو اتنے سبق کیسے دے جاتی ہے؟ ہم خود بخود اتنی مشکل بولی کیسے بولنے لگ جاتے ہیں؟ کل تک ہر بات ہنسی مذاق میں اُڑا دینے والی اور ہر پل زندگی کا رس نچوڑنے والی لاریب کو بھی تو یہ بولی اُسی ”عشق“ نامی اتالیق کی ہی سکھائی ہوئی تھی۔ سچ کہ محبت صدیوں کا سفر محلوں میں طے کرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ ایک پل میں جواں، رعنا اور حسین دلوں کی رگوں سے زندگی اور نسوں سے خون نچوڑ کر انہیں ضعیف تر کر دیتی ہے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا کہ ”میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں۔“ پھر مجھ سے وہاں رُکا نہیں گیا۔ باہر جاتے وقت کرم دین سے یہ بھی پتا چلا کہ بڑی مالکن لوگ تو اب رات دیر سے ہی لوٹیں گے۔ میں درگاہ پہنچا تو ہماری چار روزہ غیر حاضری کے دوران درگاہ کا صحن خزاں رسیدہ پیلے اور زرد پتوں کی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ انگوڑی خشک بیلین اُداس ہو کر میری راہ دیکھتے دیکھتے منڈیر تک بڑھ آئی تھیں اور چشمے کے منہ اور تازہ پانی کا جھرنایو نبی بپتے بپتے انہیں اپنی جھنکار سے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس خاموشی اور سکوت سے مہبوت سا ہو گیا۔ کیا جنت کا سکون اس ماحول سے کچھ سوا ہوگا؟

شام ڈھلے ایک اور خوش گوار حیرت سلطان بابا اور اصغر صاحب کے روپ میں درگاہ کی ویرانی کم کرنے کا سبب بن گئی۔ سلطان بابا نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اصغر صاحب کے بے حد اصرار پر کہ وہ دوائیں اور آرام کا سلسلہ درگاہ پر بھی جاری رکھ سکتے ہیں انہیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن صرف اس شرط اور وعدے پر کہ وہ اگلا ایک ہفتہ مسلسل آرام کریں گے اور زخم بھر جانے کے بعد ہی روزمرہ کے کاموں میں حصہ لے سکیں گے۔ اصغر صاحب کی نیت یہی تھی کہ اب وہ باقی ماندہ زندگی یہیں اسی درگاہ میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے کاٹ دیں لیکن سلطان بابا نے انہیں پھر سے

اپنے گھر لوٹ جانے کی تلقین کر رکھی تھی۔ وہ اصغر صاحب کو پہلے ہی چھ کلمے اور ایمان مفصل اور ایمان مجمل پڑھوا کر اُن کے ایمان کی تجدید کروا چکے تھے۔ سلطان بابا کے بقول اصغر صاحب کا اصل امتحان اور کفارہ جبل پور سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ انہوں نے اصغر صاحب کو یہ بھی بتایا کہ شروع کے چند مہینے اُن پر بے حد سخت گزریں گے کیوں کہ مفتی قوتیں اب انہیں چین سے جیسے نہیں دیں گی۔ لیکن انہیں ہر حال میں ثابت قدم رہ کر سختی اور ہر مشکل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی میں اُن کی نجات ہے کہ وہ اب آخری سانس تک مذہب کا دامن سختی سے تھامے رہیں۔ اصغر صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

اگلی صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ ہفتے بھر کی جھڑی کے بعد سورج نکلا تو جیسے ہر چیز پر لگے گہن کو پھر سے چمکا گیا۔ روشن اور چمکیلی سمسین بھی تو زندگی بڑھانے کا سبب ہوتی ہیں۔ میں بھی اس صبح کی چمکیلی کرنوں کو انگوڑی کیلوں کے چھت سے چھن کر آتے اور نیچے بہتے نالے کے پانی سے آنکھ پھونکی کھیلنے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا بھونپو بجا۔ اصغر صاحب اور سلطان بابا بھی اندر اپنے کمرے میں ہی تھے۔ پھر چند لمحوں بعد ہی وہ نسیم عمر کی طرح بہتی اور جیسے پانیوں پر چلتی ہوئی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ زہرا آج اکیلے ہی آئی تھی۔ ضرور اُسے لاریب نے میری درگاہ پر واپسی کی اطلاع دے دی ہوگی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

”آپ کے گھاسل کے ذمہ بھرنے تلک میں خود ہی غڈ حال ہو کر نہ گر پڑوں..... بہت بڑے امتحان میں ڈال گئے تھے آپ مجھے۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ ”وارکاری تھا..... تو مسیحا بھی اتنا ہی اعلیٰ ظرف چاہیے تھا جتنی زخم کی گہرائی تھی..... کہ اس بیماری کا مرہم بھی تو صرف ظرف کا پیمانہ ہی ہوتا ہے..... اور آپ نے خوب مسیحا کی ہے..... جس کا اندازہ مجھے کل ہی اُس سے ملاقات میں ہو گیا تھا۔“

زہرا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف اُسے اتنا ہی بتایا تھا کہ ہم تو خود ابھی تک ایک دوسرے کی کھوج میں ہی تھے۔ اور یہی سچ بھی ہے ساحر..... میں نے آپ کو ریزہ ریزہ چن کر اور پل پل میں پایا ہے..... اور ابھی تو میں صرف آپ کے وجود کی پرچھائی تک ہی پہنچی ہوں..... اور ابھی تک ہر نیا دن مجھے آپ کی روح کے ایک نئے رُخ، ایک نئے زاویے سے متعارف کروا رہا ہے۔ ہر روز میری رُوح ایک نئے ساحر سے ملتی ہے۔ اتنا عرصہ دُور رہنے کے باوجود ابھی یہ ملاقات ہر لمحہ، ہر پل جاری رہتی تھی..... میں نے تو لاریب سے صرف اتنا ہی کہا کہ اگر وہ بھی میری اس کھوج میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی..... کہ یہ تلاش ہی کچھ ایسی ہے کہ شاید تمہا میرا اس پر نہ تو حق ہے اور نہ ہی اختیار.....“

میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف زہرا ہی اعلیٰ ظرفی کا یہ جوا کھیلنے کی جرأت کر سکتی ہے۔

میں نے زہرا سے پوچھا ”تو پھر لاریب نے کیا جواب دیا.....؟“

”وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو دے سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ جذبوں پر اختیار کی ماہر تو نہیں، لیکن وہ اس کھوج پر صرف اور صرف میرا حق اور اختیار مانتی ہے۔ اُسے اس بات پر بھی بے حد شرمندگی تھی کہ اُس کے منہ زور جذبے کی بے پناہ طاقت نے اُس کی ظاہری حالت پر اس قدر اثر ڈالا کہ آپ تک اُس کی خبر پہنچ گئی اور آپ کو پریشانی میں مجھے یہاں بلوانا پڑا..... لیکن بقول لاریب کہ یہ اُس کی درپردہ شدید خواہش کی

تخیل بھی تھی کہ میری اور اُس کی کبھی ملاقات ہو سکے۔۔۔۔۔ میں چپ چاپ اور دم سادھے اُس شہزادی کی کہانی سنتا رہا۔ ہاں زہرا اک شہزادی ہی تو تھی جس کا راج پاٹ میرے دل کی سلطنت پر چلتا تھا۔ یہ دل بھی تو ایک بادشاہ کی طرح ہی اپنی سلطنت کا قبضہ کسی ایک کو ہی دیتا ہے۔ خود ہی اپنا سو بھر رچاتا ہے اور پھر جس کسی کے گلے میں یہ اپنے پیار کی مالا ڈال دیتا ہے اُسی کے ساتھ جنوں کے بندھن باندھ لیتا ہے۔ میری مالا بھی اُسی دن زہرا کے گلے میں ڈال گئی تھی جس دن میں نے پہلی بار اُسے درگاہ پر دیکھا تھا۔ لیکن اُس پہلے دن والی زہرا اور آج میرے سامنے کھڑی اس راج کماری کے دل میں کتنا فرق تھا۔ تب وہ سراپا سنگ تھی اور آج موسم کی ایک گڑیا۔۔۔۔۔ آج پہلی بار اُس نے یوں کھل کر خود اپنی رُوح پر میری سپردگی قبول کی تھی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ کتنی بار میری رُوح نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کتنی بار میرے قدموں نے لہو لہان ہو کر راستے میں ہی سپر ڈالنے کی دہائی دے ڈالی۔ کتنے ہی خار میری کول رُوح میں یوں چبھے کہ پھر اندر ہی ٹوٹ کر عمر بھر کا ناسور بن گئے۔۔۔۔۔ کتنی بار اس شدید تپتے صحرا میں میں یوں جاں بلب ہو کر گھٹنوں کے بل گرا کہ سورج کی تپش اور جھن سے میری جان میری جلتی آنکھوں کے راستے بہتے خشک ہو کر بے جان ہو گئی۔ لیکن میں چلتا ہی رہا۔۔۔۔۔ ایک سراپا کو اپنا نشان منزل بنائے۔۔۔۔۔ اور آخر کار آج میں نے یہ صحرا پار کر ہی لیا تھا۔ میرے سامنے اب ایک وسیع سمندر تھا اور میری جان میرے کٹے پھٹے بوسیدہ جسم کے ساتھ میرے زخمی گھائل ہونٹوں پر آن لگی تھی۔ لیکن کیا اپنی جان اس جان آفرین کے سپرد کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی گھڑی ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔؟ میں نے آخر کار محبت کا وہ قلعہ فتح کر ہی لیا تھا جس کی تفصیل تک پہنچنے کی آرزو میں ہی لاکھوں دم توڑ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور صدیوں کی ریاضت کے بعد کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا اگر اس قلعے کے آس پاس پہنچ بھی جائے تو عشق کا وہ عفریت، وہ دیو جو اس قلعے کی حفاظت پر معمور ہے، جس کی ہزار آنکھیں اور ہزاروں ہاتھ پاؤں ہیں، وہ بل بھر میں ہی اُس زخموں سے چور عاشق کو آگے بڑھ کر اپنے ایک ہی ڈنگ سے دو حصوں میں تقسیم کر کے اُس کی رُوح قبض کر لیتا ہے۔ لیکن ساحر نے آج عبداللہ کے روپ میں اُس محبت کے قلعے پر اپنا جھنڈا لہرائی دیا تھا اور اس قلعے میں قید پری آج میرے سامنے خود کو سپرد کرنے کے لیے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس شہزادی کے لبوں پر ایک وحشی مسکان تھی اور اس کی ستارہ چلکیں لرز رہی تھیں۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ایک سہ سالہ خود اپنی فتح پر آج رو پڑا تھا۔ یہ آنسو ہزاروں زخموں سے چور اُس کے بدن سے اُٹھتی درد کی ٹیسوں کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، نہ ہی اُسے ان ان گنت کات کے داغوں اور کٹی پھٹی جلد کا کوئی غم تھا جو اب تا عمر اس معر کے میں ملے تمنوں کی صورت میں اُس کے چہرے اور جسم کی نشانی بنے رہیں گے۔ یہ آنسو تو کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہے تھے کہ ہم بہت زیادہ ہستے ہستے بھی تو رو پڑتے ہیں۔

زہرا نے مجھے خاموش پا کر اپنی نظریں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ”یہ کیا۔۔۔۔۔؟ آپ رورہے ہیں ساحر۔۔۔۔۔ اب تو منزل سامنے ہے۔۔۔۔۔ بہت قریب۔۔۔۔۔ خدا کے لیے خود کو یوں آزر دہ نہ کریں۔۔۔۔۔ میری رُوح کا آخری ریشہ تک آپ کا مقروض ہے۔۔۔۔۔ کبھی میں نے آپ کو رُوح کا قبضہ ملنے تک کے انتظار کا کہا تھا۔۔۔۔۔ آج میں آپ سے کہتی ہوں کہ میری رُوح خود آپ کی منتظر ہے۔۔۔۔۔ آ کر اپنی ملکیت کا قبضہ لے لیں۔۔۔۔۔ جب آپ کا جی چاہے۔۔۔۔۔ میری رُوح چلکیں بچھائے آپ کو آپ کا انتظار کرتی ملے گی۔۔۔۔۔“

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ آنسو خود میری منزل کو سامنے دیکھ کر اُس کے استقبال کے لیے ہی تو بہہ نکلے تھے۔

اتنے میں سلطان بابا بھی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بہت سی دعائیں دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے زہرا کو دیکھ کر کہنے لگے ”تمہارا یہ قیدی اب جلد تمہارے حوالے کر دیا جائے گا کہ اس کا جنوں تو دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لیکن دھیان سے بیڑیاں ڈالنا اس کے اندر کی کھوج کسی کروٹ چین نہیں پاتی.....“

زہرا جو مسکراتے ہوئے سر جھکائے سلطان بابا کی بات سن رہی تھی، اُس کے چہرے پر حیا کے کئی گلابی سائے پل بھر میں ہی گزر گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں پائی اور ہم سے رخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ درگاہ کی منڈیر کے پاس رُک کر اُس نے پیچھے مڑ کر مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ کیا کچھ نہیں تھا صرف اُس ایک نظر میں، جانے کتنی صدیوں کا ٹھہراؤ، جانے کتنے جنم کی ایک طمانیت.....

زہرا کے جانے کے بعد وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ ایسا میرے ساتھ ہمیشہ ہوا تھا۔ وہ جب جب میرے سامنے آئی تھی، میرے لیے جیسے وقت ختم سا گیا تھا اور جیسے ہی وہ منظر سے اوجھل ہوئی، وقت جیسے پھر اپنی رفتار چل پڑتا تھا۔ تیسرے دن سلطان بابا نے جبل پور سے کوچ کا اعلان کر دیا کیوں کہ یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کل شام جو اس سال کی آخری شام بھی تھی، ہمیں جبل پور سے رخصت ہو جانا تھا۔ لیکن کہاں؟ ہمیشہ کی طرح نہ میں نے سلطان بابا سے کچھ پوچھنا انہوں نے کوئی وضاحت کی۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہو چلا تھا کہ شاید اس مرتبہ یہ میرا اور سلطان بابا کا آخری مشترکہ سفر ہوگا۔ اُدھر ہماری روانگی کا سن کر زہرا کی امی نے بھی رخت سفر باندھنے کا ارادہ کر لیا کیوں کہ انہیں بھی ہفتہ بھر سے زائد ہو چکا تھا اور وہاں شہر میں زہرا کے ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

آخر کار ہماری روانگی کا دن بھی آن پہنچا۔ جاتی خزاں کی شامیں ویسے بھی بہت اُداس ہوتی ہیں لیکن دسمبر کی وہ آخری شام اُداسی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا درد اور کسک بھی اپنے اندر پنہاں لے کر اُتری تھی۔ ہمیں پہلے درگاہ سے خان صاحب کی حویلی اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن جانا تھا کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ زہرا کی گاڑی بھی خان صاحب کی گاڑی سمیت ہمیں اسٹیشن چھوڑنے جائے گی کیوں کہ وہاں تک جبل پور سے نکلنے کا راستہ سانجھا تھا۔ درگاہ سے نکلنے سے پہلے میں اصغر صاحب کو وداع کہنے لگا تو وہ مجھے گلے لگا کر بھرا سے گئے۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں چپکتے چپکتے خود میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سلطان بابا نے ہم دونوں کو دلاسا دیا اور اصغر صاحب سے بولے ”یہ آنسو بہتے رہتے چاہئیں، من ہلکا اور زرخیز رہتا ہے۔ یہ خشک ہو جائیں تو دل کی زمین بھی بخر ہو جاتی ہے، یہ آنسو ہی ہماری آنکھ کا وضو ہوتے ہیں۔ سو آنکھوں کو پاک کرتے رہنا ہوگا، کفارہ ادا ہوتے رہنا چاہیے۔“ اصغر صاحب نے آخری بار مجھے گلے لگایا ”عبداللہ میاں..... میں تمہیں اپنا دوست کہوں، بیٹا کہوں، محسن کہوں، یا رہبر..... ایک ساتھ کتنے رشتوں کا خزانہ دیے جا رہے ہو تم مجھے..... کیسے لوٹا پاؤں گا میں یہ سب۔“ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”اپنا بھی کہتے ہیں اور واپس لوٹانے کی بات بھی کرتے ہیں..... اپنوں میں سودے بازی نہیں ہوتی..... آپ جب اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو مجھے اطلاع ضرور کیجیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا..... نصیب میں ہوا تو میں بہت جلد آپ سے آکر ملوں گا۔“

ہم نیچے گاؤں میں پہنچے تو حویلی کے سبھی ملازمین اُداس سے گیٹ کے باہر ہی سفر کی تیاریوں میں مصروف نظر آئے۔ بشیرے، کرم دین اور جمالے نے خاص طور پر مجھے گلے لگایا اور سلطان بابا سے دعائی۔

وہاں حویلی کے اندر بیرونی ڈیوڑھی کے پاس بڑی مالکن اور لاریب افسردہ سی زہرا کی گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ لاریب تو زہرا کو گلے لگا کر وداع کرتے وقت اپنی آنکھیں چھلکا ہی بیٹھی۔ زہرا کی امی نے بڑی مشکل سے بڑی مالکن اور لاریب کو باہر تک آنے سے روکے رکھا کہ خواہ مخواہ سب کا سن الوداعی سے مزید اُداس اور بوجھل ہوگا۔ البتہ یہ وعدہ وہ بڑی مالکن سے لینا نہیں بھولیں کہ وہ جلد ہی لاریب کو لے کر شہر اُن کے ہاں چند دن ٹھہرنے آئیں گی۔ آخر کار حویلی سے وداع ہونے کا وہ جاں گسل لمحہ بھی آہی گیا۔ سلطان بابا نے فردا فردا سبھی کو دعا دی۔ زہرا اور اُس کی امی نم پلکوں کے ساتھ خان صاحب کے خاندان سے مل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ میں نے بشیرے کو گلے لگاتے ہوئے دھیرے سے اُس کے کان میں کہا۔ ”عبداللہ کی آمد کی خبر مجھے ضرور دینا۔“ بشیرے نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ کرم دین اور جمالے وغیرہ سے ملتا ہوا میں بڑی مالکن تک پہنچا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ ”ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟“ میں نے اُن کا اپنے سر پر رکھا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”میں اپنی آنکھیں سبیں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب دل چاہے ان میں جھانک کر مجھے بلا لیجیے گا۔“ میں مزید اُن کی لرزتی پلکوں سے نظر نہیں ملا پایا اور سب سے آخر میں گم سم سی کھڑی لاریب کی طرف بڑھ گیا۔ ”مجھے رخصت نہیں کریں گی؟“ وہ جیسے پل بھر میں ہی کسی اور دنیا سے واپس آ گئی۔ ”پہلے میں آپ کے ہونے کا کامل یقین تو خود کو ہو جانے دوں۔۔۔۔۔ رخصت تو بہت بعد کا مرحلہ ہے۔۔۔۔۔ آپ کے لفظوں کا مرہم سدا میرے ساتھ رہے گا۔۔۔۔۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو۔“ میں پلٹ کر خان صاحب کی گاڑی کی طرف چل دیا جہاں سلطان بابا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑیاں حویلی سے باہر نکلیں تو میں نے بڑی مالکن اور لاریب کی جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے جبل پور کو ایک عجیب سی اُداسی میں گھرتے ہوئے محسوس کیا۔ ہم اسٹیشن پہنچے تو گاڑی پہلے ہی لگ چکی تھی۔ خان صاحب نے لپکتے جھپکتے نوکروں کی مدد سے ہمارا برائے نام سامان بوجی میں منتقل کر دیا۔ زہرا اور اُس کی امی بھی ہمیں وداع کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ یہاں سے ایک بار پھر میرے اور زہرا کے راستے عارضی طور پر جُدا ہو رہے تھے۔ پھر وہی الوداع۔۔۔۔۔ پھر وہی کسک اور تڑپ۔۔۔۔۔ مجھے ہر بار یہ الوداع اُس رنگ زدہ گلوٹین کی طرح لگتا تھا جس کے نیچے کٹنے کے لیے سجائے گئے عاشق کا سر کٹ تو جائے، پردھڑ سے پوری طرح علیحدہ نہ ہونے پائے اور اس بے کس اور مجبور عاشق کی جان تڑپ تڑپ کر اور نکتے نکتے یوں نکلے کہ اُس کے پیٹھ پیچھے بندھے ہاتھوں اور پیروں کی سخت مشکلیں جان کنی کے عالم میں اُس کے جسم کے ریشوں میں گھسٹی جائیں لیکن ہاتھوں کی بندش کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے تڑپ بھی نہ سکے اور بندھے پیر اُسے ٹھیک طرح سے ایڑیاں رگڑنے کا موقع بھی نہ دیں۔ کچھ ایسا ہی حال اُس وقت میرا بھی تھا۔ خان صاحب نے رخصت کرنے سے پہلے زور سے سمجھنجھگٹے گلے لگایا اور دوبارہ جبل پور آنے کا وعدہ لیا۔ زہرا کی امی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی ”ہم سب تمہارے منتظر ہیں گے۔۔۔۔۔ اس بار دیر نہ کرنا بیٹا۔۔۔۔۔“ آخر میں وہ پری زاد ایک بڑی سی کالی چادر میں اپنے گلاب رخ چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ میرے وداع کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس کی جھکی نظر اٹھی ”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ میں نے خود کو جمع کیا۔ ”میں آپ کو آپ کے ہر انتظار کی حد سے پہلے آ کر ملوں گا۔۔۔۔۔ اب مجھے وداع کر دیں۔۔۔۔۔“ اُس نے پھر اپنی نظر جھکا لی۔۔۔۔۔ سب مدہم پڑ گیا۔ ”کچھ الوداع رخصت کرنے کے لیے نہیں۔۔۔۔۔ اگلی ملاقات کی پیشگی خوش آمدید کہنے کے لیے ہوتے ہیں، سو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ خوش آمدید“ میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا ”خوش آمدید۔“ ٹرین کی آخری سیٹی بھی بج چکی تھی۔ سلطان بابا نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہم

دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ٹرین نے ایک ہچکولا لیا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے نکلنے لگی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا لیکن زہرا کا ہاتھ یونہی ہوا میں جیسے معلق ہی رہ گیا۔ ٹرین کے سامنے سے ہٹتے ہی دُور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی ایک آخری کرن تیزی سے زہرا کی جانب لپکی اور میں نے بہت دُور سے بھی اُس کی آنکھ میں نمی کی چمک لہراتے دیکھی۔ شاید یہ جبل پور کے سورج کا مجھ اور زہرا کو آخری سلام تھا۔ پلیٹ فارم سے دھوپ اور اسٹیشن سے گاڑی دُور ہوتی جا رہی تھی۔ سورج میرے دل سے بولا

سنو ڈبیر

اُسے پکارو

اُسے بلا دو

اُسے ملا دو

اب اس سے پہلے کہ سال گزرے

اب اس سے پہلے کہ سانس نکلے

وہی لکیریں، وہی ستارے

میری ہتھیلی میں قید کر دو

یہ آخری شب کے آخری پل

کوئی بڑا اختتام کر دو

یہ زندگی بھی تمام کر دو

سنو ڈبیر.....

اُسے پکارو.....

اُسے ملا دو.....

❖.....❖
ختم شد
❖.....❖

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

**send message at
0336-5557121**